کوکھ جلی

راجندر سنگھ بیدی

کوکھ جلی

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

فہرست

لمس

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات ہجوم کے بہت سے آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ ان کے سامنے رسّی کے حلقے میں، پتھر کے ایک بڑے سے چبوترے پر ایک مجسمہ بڑی سی چادر میں لپٹا ہوا تھا جسے وہ بار بار دیکھتے دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں جھپکتے، بے اطمینانی ظاہر کرتے ہوئے جمائیاں لیتے، اور پھر دیکھ کر اپنی بساط کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے۔

ٹھنڈی سڑک روزمرّہ کی طرح دھوپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ ایک جگہ دو رویہ پیپل، شیشم، کروٹن چیل اور املتاس کے درخت سڑک پر جھکے ہوئے تھے اور ان کے خزاں زدہ پتّوں میں سے سورج کی کرنیں چھن چھن کر سڑک کے سرمئی سیاہ رنگ کو جذامی بنا رہی تھیں۔ آج صبح ہی سے کول تار ریت اور پتھر علاحدہ علاحدہ ہو کر ناچنے لگے تھے ـــــــ نقاب کشائی کی رسم دیکھنے کے لیے ایک اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا جس کا ایک حصّہ زیادہ حرکت میں آگیا تھا۔۔۔۔ فضا میں ہو ہو کا ایک تکدّر پیدا ہوا، جس میں ایک مبہم سی ہیبت بھی شامل تھی اور ایک صوتی تغزّل بھی ـــــ پھر پیپل، کلیپ، کلیپ، کلیپ، کلیپ لاتعداد تالیاں ایک ساتھ بجا رہے تھے اور سڑک کا واحد شیشم اپنی

سیکڑوں سیٹیوں کے ساتھ مجمع سے ہمنوا ہو رہا تھا ....ہجوم کے وسط میں سے سانپ آیا سانپ آیا کی آواز سے آتش بازی کا سا ایک انار چھوٹا اور بظاہر شیرازہ بکھر گیا، لیکن دائیں بائیں سے 'ہاتھی آیا' کے لایعنی نعروں سے پھر لوگ جمع ہو گئے۔

چبوترے کے سنگِ خارا پر کچھ سنہری الفاظ کندہ تھے۔

سر جوارام

۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک

ایک بڑا سخی اور آدم دوست

ہجوم اور الفاظ ایک دوسرے کو مسلسل گھور رہے تھے ـــــ "گپت دان کیا کرتے تھے ہمیشہ ـــــ" سیوا سمتی کا ایک رضا کار اپنے سرخ سکارف کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے بولا ـــــ "بڈھے نالے کے پار جودھوا آشرم ہے نا، اس کی دری اٹھائی گئی اور اس کے نیچے بیواؤں کی مدد کے لیے پانچ سو کے نوٹ ملے۔"

"چہ.. تو کیا ہوا" .... ہجوم میں سے ایک طرے باز نوجوان بولا:

......"بات یہ تھی کہ سخاوت بے طریقہ تھی" اور کسی بابو نے تائید کرتے ہوئے کہا "اس میں عورتوں کی ٹریفلنگ زیادہ ہوئی اور کیا حاصل ہوا؟".... لیکن جناب ..." کوئی بولا "آپ کو ان کی نیت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، یہ تو منتظمان کی حرام زدگی ہو گی" اور ایک گیانی جی اپنی چنبل سے بھری ہوئی گردن کو کھجاتے ہوئے بولے "گیتا میں صاف لکھا ہے کہ دانی کو اپنے دان کا پھل پراپت کرنے کے لیے پھر جنم دھارن کرنا ہوتا ہے۔"

ہجوم کا شور نسبتاً بلند ہو گیا "یونیورسٹی ہال اور اس کے وسیع برآمدے میں طلبہ جیومیٹری کے پرچے دے رہے تھے ـــــ مثلث میں دو خطوں

کی مجموعی لمبائی تیسرے خط کی لمبائی سے زیادہ ہوتی ہے۔ ایک طالب علم نے سوچا اور اس کا جی چاہا، کہ وہ تمام کاغذ پھاڑ کر سیاہی انڈیل کر سامنے رقصاں و خنداں، لرزاں و حیراں ہجوم میں شامل ہو جائے۔ بڑے زور سے چیخے اور کہے ہمیں اس جومیٹری کا فائدہ ہی کیا۔ شور مچاؤ اے اہلِ وطن ـــــ اور فقط شور . . . . اور کان پڑی آواز سنائی نہ دے ـــــ صاحب سپرنٹنڈنٹ نے زور زور سے کچھ ہاتھ گھنٹی پر مارے لیکن گھنٹی کی آواز بھی شور میں حل ہو کر رہ گئی۔ وہ بوکھلا کر اُٹھے اور خود باہر آکر مجمع سے مخاطب ہوئے ـــــ
"جناب آپ لوگوں کو اس بات کا خیال ہونا چاہیے . . . "
دُبلے پتلے بے بضاعت سپرنٹنڈنٹ کی بقیہ آواز ایک لامتناہی غلغلے میں گم ہو کر رہ گئی . . . . لوگ ہنسنے لگے "اس بات کا خیال ہونا چاہیے، خیال لیے پھرتا ہے ـــــ جا بیٹھ اپنی ماں کے پاس، ورنہ ڈھونڈتی پھرے گی اپنی عینک . . . . اپنی ریڑھ کی ہڈی . . . . جا جا" . . . . اس کے بعد کاروں کی پوں، پوں، فٹنوں اور رئیسی ٹانگوں کی ٹن ٹن سے فضا اور بھی پُرشور ہو گئی۔ ایک سارجنٹ کہیں سے نمودار ہوا اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ہیٹ کو اونچا کیا اور اپنا بیٹن تان کر، ہجوم میں یوں گھومنے لگا جیسے کوئی تیز سی چھری خربوزے میں پھر جائے ـــــ "کاروں کو ادھر پارک کرو۔ اے یو انڈین۔ دائیں طرف" سپاہی بولا "آپ کا نمبر کیا ہے۔" پی پی ۵۶۲، اور لائسنس" ـــــ "یہ لائسنس دیکھنے کا وقت ہے۔"

"ہو ہو ہو . . . "

"راجا صاحب ہیں کہاں؟"

"ارے میاں کھینچ دو بُت کی رسی کو خود ہی۔ آخر اس تکلف میں کیا دھرا

ہے؟"

"ہونا دیسی وقت......"

"چھ! — ایک... بڑا... آدم دوست!.."

کچھ دیہاتی بھائی پھیر وا اور اس کے نواح سے شہر کا کوئی میلہ یا عجائب گھر دیکھنے چلے آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے لمبے لمبے لٹھ تھے جن کے سروں پر لکڑی کے "چوہے" بندھے ہوئے تھے۔ ان کے دُموں سے گانٹھیں باٹی ہوئی سَن کی رسیّاں لٹک رہی تھیں جنھیں وہ کھینچتے اور کھڑپ کھڑپ کا بے ہنگم بے معنی، بے تال ساز بجاتے اور گاتے — "کھٹن گیا تے کھٹ کے لیاندا جھالنواں...."

"راستہ چھوڑ دو۔ راستہ چھوڑ دو"..... ہجوم آپ سے آپ پھٹنے لگا۔ اور ایک کشمیری پنڈت زار و نحیف، قیصر ولیم کی سی ڈاڑھی چھوڑے، دانتوں سے اپنے ناخن کاٹتا ہوا چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے گلے کا سنہری سروپا اس کے گھٹنوں کو پھانس رہا تھا۔ بار بار وہ جھک کر سروپا کو گھٹنے سے علاحدہ کرتا.... مبادا یہ عزت و افتخار کا نشان اسے سرنگوں کر دے....

یہ راجا صاحب تھے جن کے ہاتھوں بُت کی نقاب کشائی ہونا تھی۔ زندگی کے ہر تجربے نے ایک لکیر اُن کے چہرے پر ڈال دی تھی۔ کہیں کہیں خطوط کے مجمعے پڑے ہوئے تھے جن میں نیلی نیلی وریدیں الجھتی سلجھتی ہوئی ایک بڑی سی گانٹھ کی صورت میں کنپٹی کے قریب نمایاں ہو گئی تھیں۔ "جب یہ راجا، یہ نقاب کشا مرے گا تو اس کا بت بہت حسین بنے گا" کسی نے سنگتراش کے نقطۂ نگاہ سے جانچا۔ "آج کسی کی نقاب کشائی کرتا ہے، کل کوئی اس کی نقاب کشائی کرے گا" — گویا راجا مہندر ناتھ کوئی بہت بڑا جرم کر رہا ہے

کسی کی بہو بیٹی کی طرف دیکھتا ہے۔ ہجوم ہمیشہ ہمیشہ ہجوم ہی رہتا ہے ـــــ
اس وقت دیہاتی اپنے بے ہنگم گیت کا دوسرا مصرعہ گارہے تھے : کھٹن گیاتے
کھٹ لیاندا جھاداں، نے جاندی داری دس نہ گیا میں چٹھیاں . . . کدھر نو پاداں"
. . . . اور بدستور چوہوں کی کھٹ کھٹ سے، ہجوم کی بے ربط آوازوں میں چند
اور کا اضافہ ہورہا تھا . . . .

سیوا سمتی والوں نے لٹھوں کو تانے ہوئے، ہجوم کے ایک بڑے سے
ریلے کو روک دیا۔ راجا صاحب نے اپنے منہ میں ثعلب مصری کا ایک ٹکڑا
اور الائچی ڈالی اور گلے کو "اوہوں، اوہوں" کی متعدد آوازوں سے صاف
کرتے ہوئے بولے "...... حضرات! انیسویں صدی میں ایک معجزہ ہوا اور
وہ سر جیوا رام کی پیدائش تھی" . . . لوگ معجزے کے متعلق سوچنے لگے . . .
عام آدمیوں کی طرح جیوا رام بھی پیدا ہوگیا . . ہا ہا . . . کیا روح القدس آیا تھا؟ . . . . کچھ
آدمیوں کے گالوں پر فی الواقع آنسو بہہ رہے تھے، ان کے دل میں سخاوت اور آدم دوستی کا جذبہ
اس قدر بلند ہوچکا تھا کہ وہ مال اور دولت اور بیوی تک سخاوت میں دے دینے کے لیے تیار ہورہے تھے

سیوا سمتی کے ایک کارکن نے دو دفعہ نقاب کی رسی راجا کے ہاتھوں
میں دی اور وہ دونوں دفعہ پھسل گئی جس کا مطلب تھا کہ راجا کا جلد ہی مجسمہ
بن جائے گا۔ آخر راجا نے ایک جھٹکا دیا اور مجسمہ بے نقاب ہوگیا . . . .

لوگوں نے تالیاں بجائیں، پھول پھینکے . . . آخر یہ بات تھی! پھر وہ سوچنے
لگے۔ وہ ناحق دو گھنٹے کھڑے رہے۔ لیکن مجسمہ خوبصورت تھا، مرمریں، بالکل
روئی کا ایک بڑا سا گالا دکھائی دیتا تھا۔ سنگ مرمر کو کسی اطالوی نے
اس قدر صفائی سے تراشا تھا کہ فرغل کی ایک ایک شکن واضح طور پر نظر
آرہی تھی۔ مونچھوں کے بل صاف دکھائی دے رہے تھے یہ مونچھیں بت اپنی

زندگی میں لب لگا کر بنا کرتا تھا اور پھر ہاتھ کی رگیں بھی دکھائی دے رہی تھیں یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ہاتھ ابھی حرکت میں آجائے گا، ایسے ہی جیسے نقاب کشا کا ہاتھ بت بن جائے گا۔ بُت اور نقاب کشا میں کوئی رازداری تھی۔ انھیں ایک دوسرے سے کوئی خاص ہی ہمدردی تھی۔

شور اور بھی بلند ہو گیا۔ ہال کا ممتحن منہ پر جھاگ لانے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عینک کو سنبھالا، دوسرا ہاتھ ریڑھ کی ہڈی پر رکھا اور حلقے کے تھانے کو ٹیلیفون کرنے کے لیے ایک چھوٹے ممتحن کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا۔

املتاس کے درخت تموّن کی پتلیاں نچا نچا کر ہنسنے لگے۔ کرو ٹن چیل سڑک کی سانوری صورت کو چومنے کی خواہش میں سائیں سائیں کرتا ہوا جھک گیا۔ اس وقت سورج کے سامنے ایک بہت بڑا بال آجانے سے سڑک کا جذام دور ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی گدگدی کی طرح ایک خوشگوار پھوار سی پڑنے لگی۔ بُت کے رشتہ دار، نیم بُت، دیوتاؤں کی اس خوشنودی کے اظہار پر بہت خوش ہوئے۔ آخر خدا کو بھی ان کے باپ یا دادا کی سخاوت اور آدم دوستی پسند تھی۔

نقاب کشائی کے بعد بھی ہجوم کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا —— لوگ ابھی تک آنکھیں جھپک رہے تھے۔ کیا بس یہی معاملہ تھا؟ کیا وہ صرف اسی بات کے لیے دو گھنٹہ کھڑے رہے تھے؟ —— مجسمہ برف کی طرح سفید ہے، برف کی طرح منجمد! —— لیکن آخر بات کیا ہوئی؟

"۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۹۳۱ء تک —— اُونہہ! کیا پتا وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہو۔"

"اس کا مطلب ہوا ناکہ اڑسٹھ سال۔"

"نا۔ نا ـــــ اُنہتر ـــــ سن باسٹھ تیری ماں کے پاس چلا گیا۔"

"اُلّو کا پٹھا ـــــ"

"تو ـــــ"

"تو ـــــ"

"تیرا باپ ـــــ"

اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا۔ ایک تیز فلم کی طرح کچھ مناظر آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ایک دو پگڑیاں زمین پر پڑی تھیں۔ یا کبھی کبھار کوئی کرسی ہوا میں اچھلتی اور املتاس کی پتلیوں کو چھوتی ہوئی نیچے آرہتی۔ لڑائی ہوئی اور رک گئی۔ اور پھر سب حیرت سے مجسّمے کی طرف دیکھنے لگے اور اُسے سمجھنے کی کوشش کرنے لگے ـــــ

ایک ٹٹ پونجیا اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے بڑھا اور آنکھ کے ڈھیلوں کو دبا کر مجسمے کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی تک سیوا سمتی کے لوگ اپنے ڈنڈے لیے کھڑے تھے۔ حالانکہ ان کا مقصد ادا ہو چکا تھا۔ کھینچا تانی میں یا تو ان کے سکارف بالکل کھل گئے تھے اور یا گلے کا پھندا بن گئے تھے۔ دائیں جیب کا چیتھڑے کے بادشاہ ایسا ڈھکنا پھٹ رہا تھا جس میں سے چھاتی کا دایاں نپّل، جس پر بے تحاشا بال اُگ رہے تھے، دکھائی دینے لگا۔ سیناپتی کے منہ میں ایک لمبی سی وِسل تھی۔ دھکم پیل میں اوندھے منہ گرنے سے وسل اس کے حلق میں چلی گئی تھی اور دانتوں کو ناقابلِ علاج ضعف پہنچ گیا تھا آج سیناپتی کو پہلی دفعہ سیوا کا میوہ پراپت ہوا تھا۔ وہ خوش تھا اگرچہ رو رہا تھا۔

ایک افیمی نے اپنی ڈبیہ نکالی۔ ہتھیلی میں رکھ کر گولی کو مَلا اور کمیٹی کے

نلکے سے پانی کا ایک گھونٹ پی کر اسے نگل گیا۔ پانی کے قطرے ابھی تک اس کی بے قابو ڈاڑھی میں بہہ رہے تھے۔ پانی پی کر وہ مجسّے کے قریب آیا اور اپنے ساتھی سے پوچھنے لگا۔ "اوئے بنتاں سینہاں! اوکیہہ لکھیا ہئی؟ (ارے بنتا سنگھ یہ کیا لکھا ہے؟) بنتا سنگھ نے جواب دیا لکھا ہے ـــــ "ایک بڑا سخی اور آدم دوست" ـــــ "اونہہ! بڑا سخی"۔ افیمی بولا . . . ."

دراصل کسی کو سر جیوارام کی سخاوت پر یقین نہ آتا تھا۔ ہجوم کے ذہنِ لاشعور میں کوئی بات تھی۔ اس کی روح کی گہرائیوں میں کوئی ایسا جذبہ تھا جس کے تحت وہ کہہ رہے تھے ـــــ "کوئی سخاوت نہیں ـــــ کوئی آدم دوستی نہیں ـــــ سب جھوٹ ہے ـــــ سراسر جھوٹ ہے ـــــ"

مجسّے کی حقیقت کی نسبت انھیں سیوا سمیتی والوں سے زیادہ نفرت تھی جو کہ ابھی تک ڈٹ کر کھڑے تھے ـــــ افیمی، دیہاتی بابو، طالب علم سب کا خیال تھا کہ سمیتی والے ازل تک یہاں سے نہیں ہلیں گے ـــــ وہ چاہتے تھے یہ لوگ ایک دم وہاں سے چلے جائیں۔ ان کی موجودگی ہجوم میں ایک خاص قسم کا جذبۂ تنفّر اور بغاوت پیدا کر رہی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی کو مار ڈالیں، کچھ توڑیں پھوڑیں، سڑک پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کی عصمت دری کریں۔ اور نہیں تو طفلِ خورد سال کی طرح منہ ہی چڑا دیں۔ وہ منہ چڑانے سے ڈرتے نہ تھے، اگرچہ ان کے چھدرے چھدرے دانتوں پر سے اینمل اڑ چکا تھا اور وہ مکمل طور پر سیاہ پڑ گئے تھے۔ بے احتیاطی اور گوشت خوری نے ان کے دانتوں کو جبڑوں تک کھوکھلا کر دیا تھا اور وہ جبڑوں سے تقریباً علاحدہ ہو چکے تھے۔ لوگ بِنا جانے بوجھے ان مکروہ دانتوں کا مظاہرہ کر کے خوش ہو رہے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان

کے دانت جتنے بدنما ہوں گے اتنی ہی سیوا سمتی والوں کی تذلیل ہو گی۔

ان میں پتلے لوگ تھے اور موٹے بھی۔ لیکن ان کے جسم گٹھے ہوئے تھے اور تنو مند۔ انھیں خود اپنی طاقت کا احساس نہ تھا۔ اور وہ ہمیشہ اس احساس کو جگا دینے والے کی تلاش میں رہتے تھے۔ وہ سمتی والوں کے پاس کھڑے رہے ——— اور سمتی والے بھی گویا چڑ سے گئے تھے۔ تماشائیوں کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی تھی کہ سمتی والے اب کشائی کے بعد بھلا کیوں کھڑے ہیں؟ ——— ایسے ہی جیسے اپنے وہاں کھڑے ہونے کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

موٹریں، فٹنیں اور تانگے سب جا چکے تھے۔ کہیں کہیں بابو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے دفتروں کو جا رہے تھے۔ بیشتر دس بجے پہنچ چکے تھے اور کچھ دیر بعد بیکار کھڑے لوگوں نے وہاں کھڑے رہنے کی نسبت گھر اور کام پر چلے جانا مناسب سمجھا وہ کچھ دور گئے لیکن انھیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی کوئی چیز مجسّمے کے قریب بھول آئے ہوں۔ اس کے بعد ان کے پانو خود بخود واپس اُٹھ گئے۔ انھوں نے اپنے تئیں مجسّمے کے سامنے پایا ———

——— مجسمہ بالکل سورج کی کرنوں میں الجھے ہوئے بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح دکھائی دے رہا تھا

لیکن ——— "اونہہ! بیواؤں کو دان دیا ہو گا، عورتیں نکالی ہو نگی پٹھے نے . . . " ابھی تک اس قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ "عورتوں کی ٹھیکیداری بڑی نفع بخش چیز ہے ———" اور سیوا سمتی والے بدستور اپنے لٹھ لیے کھڑے تھے۔

اسی اثنا میں اپنے گلے کو "خوں" سے صاف کرتے ہوئے سیوا سمتی کا سیناپتی آ گیا اور چبوترے کے پاس پہنچ کر اپنی کھدّر کی نِکّر کو عریانی کی حد تک اونچا کرنے لگا۔ پھر اس نے رضاکاروں کو ایکاایکی قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد وہ حکم کے مطابق چلنے لگے ....

لوگ خوش تھے۔ انھوں نے رضاکاروں کے پیچھے تالیاں بجائیں۔ یہ بہتر تذلیل تھی۔ بدنما دانت اور جبڑے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ سیناپتی نے خشم آلود نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ گلے کو سہلایا اور چل دیا۔ لوگوں نے پتھروں کی طرح کے وزنی قہقہے پھینک کر رضاکاروں کو زخمی کر دیا۔ سیوا کا پھل میوہ ——

سب جانتے تھے کہ مجسمہ سنگِ مرمر کا ہے، سفید ہے، سخت ہے۔ لیکن اتنی بات سے ان کی تسلّی نہیں ہوتی تھی، وہ سات آٹھ قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوتے، ایک نظر مجسمے کو دیکھتے پھر سب کے سب اس تک پہنچ کر اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو دیتے۔

"میں انگریجی نہیں جانتا" ایک دیہاتی نے کہا:

سر جیوا رام کا بُت ہے جو ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۱ء میں مر گیا۔ وہ ایک بڑا سخی اور آدم دوست انیسویں صدی کا سب سے بڑا معجزہ۔

اب ہجوم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور ایک دفعہ پھر اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک بُت کو محسوس کیا۔ کچھ دیر بعد بُت کے پاؤں سیاہ ہو گئے ... لیکن اس کے بعد سب اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے کام پر چلے گئے۔

بیکار خُدا

یہ دُکان کچھ دنوں سے بند تھی۔ خدا جانے اس کے مالک کہاں مر کھپ گئے تھے۔ باہر لکڑی کے بڑھاوے پر مُراری جین نے کچھ سوئی اور کچھ ریشمی چوٹیاں جھوٹے موتیوں کی پوتھانیاں اور بانکڑی وغیرہ رکھ لی تھی۔ اکّا دُکّا معمولی حیثیت کی عورت چوک مولاداد سے چیل ہٹہ تک گزرتی ہوئی کبھی کبھار یہاں رُک جاتی تھی۔

کچھ مال تو یہاں بک جاتا تھا لیکن یہ نہیں کہ تانتا بندھ جائے۔ جو ہر دُکاندار کی خواہش ہوتی ہے، جو کچھ نہ بکے تو سمجھ لو کہ مُراری جین کے چار پانچ بچو نگڑے، بیوی اور ایک آدمی کے ٹکڑوں پر پلنے والے عزیز پیٹ بجانے لگتے ہیں اور جو بکری زیادہ ہونے لگے تو وسوسہ ——— ہائے دُکان کا مالک اب آیا کہ اب آیا۔ اور پھر یہ کمینہ خواہش کہ وہ کبھی نہ آئے یوں ہی کہیں چلتا ہوا ڈھیر ہو جائے۔ نہیں تو سب جھانجھن۔ وانجھن اور بانکڑی وانکڑی سڑک پر پڑی نظر آئے گی۔ اور جو کہیں اوپر سے ڈھول ڈھپّہ ہو جائے تو وہ علاحدہ۔ مراری جانتا تھا، آخر اسے بڑھاوے سے الگ ہونا ہی پڑے گا۔

ارے پھر آیا کمبخت ـــــــ سپا ہٹا۔۔۔ مُراری جین اطمینان سے دُکان لگا رہا تھا، لیکن سپاہی کو دیکھ کر ہڑبڑا اٹھا۔ یہ ایک تیسرا خطرہ تھا جو مال کے بکنے یا دُکاندار کے واپس آجانے کے خدشے سے کہیں بڑا تھا۔ یہ لال پگڑی والا صبح و شام دونوں وقت اپنے راؤنڈ پر ادھر آتا تھا، جو کوئی حکمت سے کھلا پلا دے تو بہتر ورنہ مراری کی قسم کے خوانچہ بردوش اور عارضی دکانداروں کے سنگھاڑے اور شکر قندی بیچ بازار کے پڑی ہے۔ سب ہنس رہے ہیں۔ کوئی ہمدردی کا اظہار نہیں کرتا۔ گرنا بکھر جانا بات ہی ایسی ہے کہ اسے دیکھ کر سب ہنسنے لگتے ہیں۔ یا ایک سے گیارہ سائز تک کے بڑے بڑے بدوضع چپل، ننھے منے پیارے پیارے سلیپروں کے ساتھ سڑک پر روندے جا رہے ہیں۔ لوبیا اور آنسو مٹی میں مل رہے ہیں، سنتری موج میں آئے تو چونی اٹھنی قبول، نہیں تو فرعونیت جوں کی توں قائم ہے ـــــــ اور اسی لیے نفرت سے بھرپور مراری جین لال پگڑی والے کو "سپا ہٹا" کہا کرتا تھا۔

"آج مرے رام رے۔۔۔۔" مراری نے کڑکڑاتی ہوئی آواز نکالی اس مینڈک کی طرح جس پر کسی کا پاؤں پڑ جائے۔ مراری کا خطاب اپنے گاہک سے تھا۔ گاہک نے پلٹ کر دیکھا مراری کانپ رہا تھا۔

نتھو گاہک نے دور لال پگڑی دیکھی، اور ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔

"ناحق مرے جا رہے ہو یار"

مراری نے سودا بیچنے سے انکار کرتے ہوئے کہا "نہیں بھائی تو پھر کسی وقت آجانا۔ میں اس وقت سب چیزوں پر کپڑا ڈال کر بھاگ جاؤں گا ـــــــ یہ چھوکرا رہے گا یہاں" ـــــــ اور ایک غلیظ چھوکرا بڑباؤ

کے ایک طرف بیٹھا، اپنا دامن منہ میں پپول رہا تھا، وہ مراری کا بیٹا تھا لیکن مراری کو اتنی فرصت نہ تھی کہ اسے منع کرے۔ اس نے اپنے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: "ایسے چھوٹے بچے کو تو کچھ نہ کہے گا —— مجھے نہ دیکھ کر شاید ٹل جائے۔"

نتھو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس لیے کہ کوئی اور دُکان کھلی ہے یا نہیں لیکن مراری نے اس کے کندھوں کو شفقت سے چھوتے ہوئے کہا: "تم میرے پہلے گاہک ہو —— مہا دیر کی سوگند، میں تمھیں نہیں لوٹاؤں گا۔"

نتھو نے تہبند کو رانوں میں دبایا، سر کو کھجایا اور اُچک کر مراری کے گھسے ہوئے آسن پر بیٹھ گیا۔ نتھو ایک قلی کے کپڑے پہنے ہوئے تھا سب سے پہلے اس کی جس چیز پر نگاہ پڑتی تھی وہ اس کی ناک تھی جو دس بارہ سال پہلے ایک رنڈی نے کاٹ لی تھی۔ تب سے وہ ہفتے میں ایک بار پھاہا لگاتا آج پھاہا لگے شاید ساتواں دن تھا وہ جو بہت گندہ نظر آتا تھا دوسری چیز نتھو کا موٹاپا تھا، جس کے سبب وہ گرمیوں میں کوئی بھی کام کرنے کے اہل نہیں تھا۔

نتھو نے اپنے بے تحاشا پھیلے ہوئے دامن میں سے کہیں سے ایک بیڑی نکالی اور اسے سلگاتے ہوئے بولا —— "آج ہمارا پونکھا لو، دیکھو پھر کیا ہوتا۔ . . "

مراری نے رشک کی نگاہ سے اس مفلس مگر مطمئن انسان کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: "تمہارا پونکھا ہی سہی، دیکھ لیتے ہیں، تم کیا کرتے ہو۔ . . " اور مراری کو ایک طرح کا اطمینان حاصل ہو گیا، گویا یہ قلی اسے بچالے گا۔ صبح سویرے کون زیبائش کا سامان خریدنے آتا ہے؟

یہ درحقیقت کسی بڑی طاقت کا بھیجا ہوا ہے، صرف مجھے بچانے بھگوان کے بھگت پیڑت ہوتے ہیں تو ان کی رکھشا ہوتی ہے۔ کوئی انسان بہانا بن جاتا ہے۔ مراری نے پھر ایک بار نتھو کی طرف دیکھا۔ جو بیڑی کا دھواں چاروں طرف پھیلا رہا تھا۔ جس سے افشاں کے کالے ہو جانے کا ڈر تھا...
.... کچھ سوچتے ہوئے مراری وہاں سے ٹل گیا۔ سپاہی سے آنکھ چرانے کے لیے وہ رفاہِ عام کے لیے لگے ہوئے کنوئیں کی ٹونٹی کھول کر غٹ غٹ پانی پینے لگا۔ گویا اسے کسی بات کا پتا ہی نہیں۔

سنتری اپنی جھالر کو سنوارتے ہوئے گزرا تو اس نے نتھو بے فکرے کی طرف دیکھا۔ ایک بڑی بیماری چھوٹی بیماری کو نگل دیتی ہے، سنتری دُکان میں آسن پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سوا اور کسی چیز کو نہ دیکھ سکا۔ یا اس نے کمسن بچے کی طرف دیکھا جو دامن چھوڑ کر اپنا کف چوس رہا تھا۔ جیسے مراری دور کھڑا منع کرنا چاہتا تھا لیکن کر نہیں سکتا تھا۔ جب سپاہی انھیں دیکھ رہا تھا تو مراری جین کو آسمان نیچے اور زمین اوپر نظر آنے لگی۔ سپاہی نے نتھو سے کوئی بات نہ پوچھی۔ اُلٹا نتھو اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ دُکان کے قریب سے گزرا تو مراری کے گاہک نے آسن ہی پر سے آواز دی ـــــــــ

"سنتری جی! یں یں.... ذرا دیا درشی ہی رکھیے گا!"

سپاہی نے تسلیم کے انداز میں سر ہلا دیا اور پیٹھ کے پیچھے اپنی انگلی پھنساتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس وقت مراری کو خیال آیا کہ اس نے بہت پانی پی لیا ہے۔ پیٹ میں ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس کے باوجود اسے پیاس لگ رہی ہے۔ دھوتی سے اپنا مُنہ پونچھتے ہوئے

وہ دُکان کی طرف آیا اور شکر گزاری کے انداز میں بولا ـــــــ "جان پہچان معلوم ہوتی ہے ـــــــ"

نتھو نے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کی توند سات مرتبہ اوپر نیچے ہلی، اور وہ بولا ـــــــ "میرا سالا ہوتا ہے نا۔" اور حقارت سے ہنسنے لگا۔

مراری جین نتھو کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اگر اس کی جان پہچان کا نہیں تو پھر اس نے دُکان کے یہاں ہونے پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔ بورے کا چھاتا کمیٹی کی حد سے دو فٹ آگے تھا۔ پھر بھی سنتری چُپ رہا اور مُراری کو یقین ہونے لگا۔ گاہک کو بھگوان مہاویر نے بھیجا ہے۔ اب آزمایش کے دن ختم ہوئے ہیں ورنہ کہاں نتھو کا سا مفلس آدمی اور کہاں چودانی اور بانکڑی؟ اس کے دل میں نتھو کے لیے عقیدت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس نے اعتراف کیا "تمھارا پونکھا خوب ہے بھائی . . ." اور پھر ایک جھٹکے سے اس نے کف اپنے بیٹے کے مُنہ سے نکال دیا۔ لڑکا رونے لگا۔ مراری اس کے شور سے بے خبر ابھی تک سوچ رہا تھا کہ سپاہی نے آخر اس کے گاہک سے کیوں کچھ نہیں کہا، حالانکہ اس سے روز تکرار کرتا ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہے کہ دکاندار کے سوا کسی سے بات کرنا بیکار ہے . . .

نتھو نے آسن پر سے اُتر کر بیڑی کے ٹکڑے کو پاؤں تلے مسلا اور بولا ـــــــ "دو لڑی چاہیے مجھے . . ."

مراری نے جلدی سے دو لڑیاں اور پنج لڑیاں اپنے گاہک کے سامنے بکھیر دیں اور پوچھنے لگا ـــــــ "سچ کہو لالہ، یہ سپاہی تمہارا دوست ہے؟ ـــــــ"

نتھو نے ہنستے ہوئے کہا "یار میرے سودا دوگے یا باتیں بناؤ گے

اور پھر خود ہی بولا ——— "جب ننگا آدمی نظریں نیچی کر لیتا ہے تو لوگ اسے دیکھتے ہیں۔ جب وہ سب کو دیکھتا ہے تو لوگ نگاہیں نیچی کر لیتے ہیں۔"

گاہک نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور دکاندار نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کیا سُن رہا ہے۔ وہ دونوں ہنس دیے، اور ننھا منا لڑکا روتا رہا۔ وہ اس کے وہاں ہونے سے بھی بے خبر تھے۔

"دو لڑی کا کیا لوگے؟" نتھو نے پوچھ لیا۔

"جو جی چاہے دے دینا۔"

"یوں کام نہیں بنے گا لالہ۔"

تم میرے پہلے گاہک ہو، تم سے بوہنی کر رہا ہوں . . . . تمہارا پونکھا لے رہا ہوں، تم سے دوسری بات کرنا اپنا دھرم نہیں ہے۔ اور پھر مراری جین نے دل میں سوچا یہ دکانداری نہ ہوئی، سدا برت ہوا۔ لیکن اس کا جی نہیں چاہتا تھا، نتھو سے دام لے کر کچھ دیر ہکلانے کے بعد مراری نے کہا ——— بارہ آنے" ——— اور یہی اس کی قیمت خرید تھی۔ نتھو نے مشکوک انداز میں مراری کی طرف دیکھا اور بولا ——— "بازار سے دس آنے میں مل رہی ہے، چھوٹی دو لڑی . . . . . ابھی کل ایک دُکندار لے رہا تھا" . . . مراری جین نے گاہک کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "دس آنے ہی دے دو بابا۔" نتھو نے جھجکتے ہوئے دس آنے دیے اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

شام کے چھ بجے کے قریب مراری کا 'سپاہٹا'، پھر وہاں سے گزرا لیکن اب کے اس نے مراری کی دُکان کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا ایک دو مرتبہ کھنکارنے کے بعد اس نے شام لگی ہوئی لاٹھی کو دو بار پکی سٹرک پر

مارا، لیکن اس کھنکارنے کا مطلب گلے کے بلغم سے زیادہ کچھ نہ تھا، اور زمین پر لاٹھی مارنا زمین پر لاٹھی مارنا تھا۔ شام کے قریب یہاں ایک عرس ہوا جس میں عورتوں کو چوٹیوں کی ضرورت تھی۔ مراری جین کی دکان کی جگہ اگر کوئی بھی دکان ہوتی تو پھلتی پھولتی۔ مراری کو عرس کا پتا بھی تھا، لیکن وہ جی ہی جی میں نتھو کے پونکھے کو سراہ رہا تھا۔ اگر کہیں وہ ہر روز ادھر آجائے تو شاید اسے اسی دن کی طرح گھٹنا سیدھا کرنے سے پہلے پانچ چھ روپے کی آمدنی ہو جایا کرے۔ وہ چوٹی بیچتا تھا۔ افشاں بیچتا تھا۔ اور نتھو کے متعلق سوچتا تھا ـــــ کس قدر موٹا ہے جیسے عید کا دنبہ! اور دنبے کے ساتھ اسے ایک چھوٹی سی گاڑی کا خیال آیا جو دنبے کی "چکی" کو اٹھانے کے لیے بنائی جاتی ہے، اور پھر خود بخود اس نے اپنے بچے کے متعلق سوچا جو گاڑی میں بیٹھنے کا بڑا شوقین تھا۔ شام تک وہ بچہ اپنے باپ کے پیچھے بیٹھا علی الترتیب روتا اور ہنستا رہا تھا۔ لیکن مراری کو نہ اس کے ہنسنے کا پتا تھا نہ رونے کا۔

شام کو مراری جین نے دکان بڑھائی، جب چادر کو جھاڑا اور سب سامان کو لپیٹ کر گاڑی میں رکھا، اُسے اپنی چھاتی فراخ محسوس ہوئی جیسے ورزش کے بعد پہلوان اپنے پٹھوں کو دیکھتا ہے۔ اس نے اپنی طرف دیکھا، بچے کو پیار کیا۔ پہلے غور سے سر اونچا کیا پھر انکسار کا ایک لطیف سا جذبہ اس پر طاری ہوا، اور اس نے کہا، یہ سب بھگوان مہاویر کی دَیا ہے، جس نے صبح صبح مجھے اپنی محبت کا پیغام بھیجا ہے

دوسرے دن عرس نہیں تھا۔ مراری کو زیادہ آمدن نہ ہوئی۔ صرف اتنی ہوئی جتنی عام طور پر ہوا کرتی تھی۔ . . . مراری کی خواہش تھی کہ شاید نتھو ادھر آجائے شاید پونکھا والی بات جھوٹی ہو۔ لیکن ایک دفعہ تو اور

آزمایش کا موقع ملے، اگلی صبح مراری جین نے جب اُن چوبی تختوں پر بچھانے کے لیے چادر پھیلائی تو بازار کے کونے کی دُھند سے اسے وہی آشنا خد و خال واضح ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ نتھو ناک پر ایک نیا پھاہا رکھے بدستور ناک میں ٹھمری ——— "رس کے بھرے توڑے نین کی جگہ،..... بس کے بھرے تورے نین،" —— گنگناتا ہوا آرہا تھا۔

مراری نے بڑی مشکل سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ارے یار میرے تم کدھر ٹپک پڑے؟"

"ادھر ہی آرہا تھا۔"

"معلوم ہوتا ہے تمھیں صبح ہی کو فرصت ہوتی ہے؟"

"ہاں لیکن اب فرصت ہو گی . . . سناؤ میرا پونکھا کیسا رہا؟"

"اچھا تھا" مراری نے چوبٹوں کو تار کی ایک ہک پر ٹانگتے ہوئے کہا ——— "آمدنی تو اتنی بڑھی نہیں۔ لیکن یار سپا ہٹے کا منتر خوب کام آیا۔"

"چلو کچھ تو ہوا ———"

اور نتھو نے بتایا اس کا پونکھا کس قدر اچھا ہے۔ بچپن میں نتھو کی ماں نتھو کو دہی بلونے سے پہلے گھرونچی کے قریب کھڑا کر لیا کرتی تھی۔ اس کا پونکھا لیا کرتی تھی تو مکھن جو عام طور پر ایک پاؤ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا، اُسی بیانے لائق بھینس کے دودھ سے تین پاؤ سیر نکل آتا تھا۔ قلیوں کا جمعدار پیارے اور عنی کا صبح کے وقت مل جانا بڑا انحس خیال کرتا تھا۔ لیکن نتھو کا مل جانا اس کے لیے مبارک فال تھی۔ نتھو کو خود اس بات پر پوری طرح یقین نہیں تھا لیکن آج وہ ایک کام نکلوانے کی غرض سے آیا تھا۔ اس لیے جیب میں سے وہی دُلڑی برآمد کی اور کہا۔

"یار جس کے لیے میں لے گیا تھا، اسے پسند نہیں۔"
"کسے پسند نہیں؟"ــــــ مراری جین نے نتھو کو آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔
"کیا جمانہ ہے!" نتھو نے خفیف ہوتے ہوئے کہا۔ "آجکل محبت بھی ٹکے پاؤ بکنے لگی ہے۔ کوئی دن تھے، لوگ قول پر مرا کرتے تھے . . . آج کسی عورت کو نگد نارا ین دکھاؤ، رام کرلو۔"
مراری نے نتھو سے اتفاق کیاــــــ "بابا آج گھر میں ہاتھ لٹکائے جانا کس مرد کی ہمت ہے" . . . بہت کچھ ادھر اُدھر کی ہونے کے بعد نتھو نے مطلب کی بات بیان کی۔ اسے اب دو لڑی نہیں پنج لڑی چاہیے تھی، اور وہ بھی موجودہ لڑی سے وزنی، جو دیکھنے میں اصلی موتیوں اور اصلی دانت کی دکھائی دے۔ اِمی ٹیشن اور بجلی مسالے کی نہیں۔ لڑی موتیوں کی ہو لیکن اس میں باگھ، چیتے، یا لومڑی لٹک رہے ہوں۔ یہی اس کی محبوبہ کا تقاضا تھا۔ کس آسانی سے نتھو اور نتھو سے لڑی کی محبت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس لیے نتھو کا محبت کے تقاضوں کا برا ماننا عبث تھا۔
"نتھو نے کہا۔ "لیکن میرے پاس دام نہیں، کہے دیتا ہوں۔"
مراری جین سوچنے کے لیے رک گیا، اس وقت وہ ڈبے کچھ اس ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ تمام چیزیں ایک ہی نظر میں دکھائی دے جائیں۔ ایک ڈبے کو پکڑتے ہوئے اس نے کہاــــــ تم جانتے ہو، بوہنی کے وقت کون مورکھ دکاندار ہے جو اُدھار کرتا ہے۔
نتھو نے کہا "ایک اٹھنی تمھیں دے سکتا ہوں ــــــ اور دو لڑی۔"
"مراری نے پھر سوچا اور کہاــــــ اُدھار ہی تو ہوا۔"

یہ بالکل اُدھار تو نہ ہوا"
"لاؤ لیکن باقی پیسے جلد چُکا دینا"
"نتھو نے ہنستے ہوئے کہا" میرا پونکھا کیا مفت میں آتا ہے؟" . . .
اور چل دیا۔

اس دن قسم کھانے کو کوئی گاہک نہ آیا شہر میں کچھ جلسہ جلوس تھا جس کی وجہ سے عورتیں اندر ہی پڑ رہی تھی۔ مراری سر دُھن رہا تھا ــــــ بکواس ہے۔ سب پونکھا ونکھا بکواس ہے . . . عورتوں کے لیے صرف عورتوں کے لیے۔ جو دُکن داری کرتا ہے، گھاٹے میں رہتا ہے۔ سالیاں جب جی چاہے اندر پڑ رہیں ان کے مرد بھی تو خریدنے نہیں آتے۔ دنیا میں دکھانے کی محبت بھی نہیں رہی۔ سب سے بڑا نقصان یہ کہ عورتوں کے لیے دُکنداری کرنے والا پھر مردوں کے ہاتھ کچھ بیچنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اسے اس بات کا لٹکا لگ جاتا ہے . . . . . اور مراری جین ہنسنے لگا . . . . . لیکن سب سے بڑا ڈھکوسلا یہ پونکھا ہے . . . . . اس دن شام کو تانبے کی لاٹھ والا ڈنڈا پکڑے ہوئے سپاہٹا آیا۔ مراری نے بقول نتھو ننگا ہونے کی کوشش کی لیکن نتھو نتھو تھا۔ اور مراری مراری۔ سپاہٹے نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا" دو ہفتے سے میں تیرا مُنہ دیکھ رہا ہوں . . . اگر تو یہاں سے نہ گیا تو مجھ سا بُرا کوئی نہ ہوگا . . . " مراری نے ایک دم لمبا سا منہ نکال لیا۔ اب وہ کہاں جائے گا۔ سامنے واچ میکر کے ساتھ؟ ــــــ وہاں بھی وہی حال ہوگا۔ دو دن کے بعد پھر دکان دار آئے گا . . . . . مراری رونکھا سا ہو گیا۔

شام کے قریب ایک بوڑھا آدمی مراری جین کی دُکان کے سامنے کھڑا ہوا۔ مراری اس وقت دُکان بڑھا کر چادر چھانٹ رہا تھا۔ بوڑھا ایک

پُل کے لیے کھڑا ہوا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور بے تحاشا رونا پیٹنا شروع کیا "میرے بیٹے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا"۔ . . بازار کے لوگ اکٹھے ہو گئے وہ سب بوڑھے کے ساتھ افسوس کرنے لگے۔ مراری گم سُم کھڑا رہ گیا۔ وہ بیک وقت رونا، اور ہنسنا چاہتا تھا۔ اس دکان کا مالک پرلوک سدھار گیا تھا۔ جگر کے پھوڑے کی وجہ سے دو مہینے بیمار رہ کر آخر مرگیا۔ اب مراری دُکان لے سکے گا ـــــــ خرابی میں اس کی تعمیر کی صورت مضمر تھی . . . . یہ کیوں تھا، کس لیے . . . . ؟ مراری جین نے سوچا ـــــــ یہ سب نتھو قلی کے پونکھے کی وجہ سے تھا۔

دُکان لینے اور سیاپے کے خوف سے فارغ ہونے کے بعد پہلے مراری جین نتھو سے ملنے کے لیے اسٹیشن پر گیا۔ مراری خوش تھا، اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہا تھا۔ عام کیفیت میں شاید وہ نتھو پر ظاہر نہ ہونے دیتا کہ وہ کس کام کی وجہ سے اس کے پاس آیا ہے۔ وہ کہہ دیتا، بھائی میں اعظم آباد سے واپس آرہا ہوں۔ خیال آیا راستے میں تمھیں ملتا چلوں۔ لیکن اب وہ اپنی خوشی کو دبا نہیں سکتا تھا۔ دُکان مل گئی ـــــــ اور پھر ان دنوں سستے کرائے پر . . . . نتھو کا پتا چلا وہ چھ نمبر پلیٹ فارم پر شملہ کالکا کی سواریاں لے رہا ہے۔ مراری جین جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا نتھو ایک بڑے سے بکس کو اٹھانے کی بے سود کوشش میں ہف کر رہا ہے۔ اگر وہ خود بیٹھتا ہے اور دوسرے قلی اس کی پیٹھ پر بکس رکھ دیتے ہیں تو وہ اٹھ نہیں سکتا۔ اگر وہ کھڑا ہوتا ہے تو دوسرے لوگ بکس کو اس کی پیٹھ تک اٹھا نہیں سکتے۔ اتنے بڑے پیٹ کی دھونکنی چلنے سے مراری جین کے

دیکھتے دیکھتے نتھو کے ناک سے پھاہا نکل کر دُور گر پڑا، اور اس کے چہرے پر دو خوفناک سے سوراخ نظر آنے لگے . . . . اور ان میں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے نتھو نے دوڑ کر پھاہا پکڑا، اور ناک پر رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ سوراخ کے اندر چلا گیا، اور کچھ دیر بعد خون ناک کی سطح پر نظر آنے لگا . . . نتھو خون کو دیکھ کر بچوں کی طرح ڈر گیا بکس کے صاحب چلاّ رہے تھے ــــــ "یُو ڈرٹی ڈاگ ــــــ اُٹھاؤ ــــــ اُٹھاؤ"

مراری جین نے نتھو کو بلایا ــــــ "نتھو بھیا!"

نتھو نے بکس چھوڑ دیا اور دوڑ کر مراری جین سے لپٹ گیا، اور پھر اس نے رونے کے لیے منہ چھپا لیا اور بولا ــــــ "مراری میں مر جاؤں گا" ــــــ وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد نتھو نے ہف ہف کرنا بند کیا تو بولا ــــــ "میں اب کام نہیں کروں گا۔ میں اب بہت بوجھل بہت موٹا ہو گیا ہوں ــــــ میں بھوکا مروں گا" اور مراری نے کہا "میں اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں میں تمہاری یہ دَشا نہیں دیکھ سکتا . . . . . مجھے دُکان مل گئی ہے"

"دُکان مل گئی ہے؟" نتھو نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد دونوں تھوڑی دیر کے لیے چُپ رہے پھر مراری بولا "سب تمہارے پونکھے کے کارن ہے ــــــ ورنہ ہم تو ہیں ہی سبز قدمے"

نتھو نے جی ہی جی میں خوش ہوتے ہوئے رسماً انکسار کا اظہار کرتے ہوئے کہا ــــــ "وہ تو میں تمہیں بنا رہا تھا مراری ــــــ یہ سب کچھ ایشور کی دَیا سے ہوتا ہے، انسان بھلا کیا کر سکتا ہے" . . . اس وقت کچھ لوگ بھیڑوں کے گلّے کی طرح ادھر دھکیل دیے گئے تھے۔ وہ لوگ دھمادھم

پل پر سے اتر رہے تھے۔ گاڑی وِسل دے چکی تھی اور دونوں اس کی طرف متوجہ تھے۔ اچانک مراری کو اپنا کام یاد آیا ——— وہ بولا "میں تو ان باتوں میں بڑا یقین رکھتا ہوں ..... جو آدمی تمہارا راستہ کاٹ جاتا ہے وہ تم سے کچھ لے جاتا ہے یا اپنے مقدر کا کچھ حصہ تمہاری نذر کر جاتا ہے۔

پھر مراری جین نے کہا ——— "تم اپنے چرن تو ڈالو دُکان میں ———"

"چلا جاؤں گا، چرن ڈالنے سے کیا بگڑتا ہے؟ .... لیکن بھیّا میں یہاں کام نہیں کر سکتا۔ میں کہیں بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب میرے بُرے دن آ گئے۔"

مراری جین نے دلاسا دیتے ہوئے نتھو کو کہا "تم ہو سکے تو چھوٹا موٹا کام کر دینا ——— اور نہیں تو دُکان میں پڑے رہنا۔"

نتھو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اسی طرح کی چمک جو اُن دونوں کی ملاقات کے روز مراری کی آنکھوں میں پیدا ہوئی تھی۔ جب سپاہٹا بنا کچھ کہے سُنے دُکان کے سامنے سے گزر گیا تھا۔

اب نتھو دن رات دکان پر رہتا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کرنے سے اور موٹا ہو رہا تھا۔ دکان پر پڑے ہوئے نتھو کے خرّاٹے چیل ہٹہ اور چوک مولا داد تک سنے جاتے تھے۔ نتھو مختار تھا۔ صبح کے وقت پوچھے کے لیے دکان پر ضرور ہوتا۔ لیکن جب اس کا جی چاہتا دن کے وقت سیاحت کے لیے نکل جاتا۔ اس کے نشے، اس کی تمام بُری عادتوں کا کفیل مراری جین تھا ....

مراری کی دکان چل نکلی تھی۔ اب وہ سوچتا تھا اس نے ناحق

اس سٹنڈے کو پال رکھا ہے۔ جو اس کے سارے کہنے جتنا کھاجاتا ہے موچھوں پر تاؤ دیتا ہے اور پڑا رہتا ہے۔ لیکن جس دن مراری کو آمدن زیادہ ہوتی وہ پھر اپنے دیوتا کی پرستش کرنے لگتا وہ اسے دیکھتا تھا اور حیران ہوتا تھا ——" یہ کون ہے —— کیا ہے —— کیوں ہے ؟"

اب مراری نے دکان میں اور بھی متفرقات ڈال لیے تھے۔ لیکن بہت سی نئی چیزوں کو نتھو اپنی محبوبہ کے لیے مانگ لیتا تھا وہ چراتا نہیں تھا لیکن حسنِ طلب ایسا تھا کہ مراری کو دیتے ہی بنتی تھی، مراری کسی چیز کو دے دینے کے بعد ہمیشہ تاسف سے منہ لٹکا دیتا۔ لیکن اسے اس بات کا کوئی حل نہیں سوجھتا تھا آمدنی تو اپنے آپ ہی ہو رہی تھی۔ یہ نتھو کو مستقل طور پر یہاں لے آنا محض حماقت تھی، اور وہ سب کچھ اپنے زورِ بازو سے کماتا تھا۔ اور نتھو مفت کی کھاتا —— چھوٹی موٹی چیزیں۔ کلابتون، پیمک ویمک۔ ہار وغیرہ وہ یوں لے جاتا جیسے اسے ہر طرح کا حق ہے۔ مراری جین نے اپنی بیوی تک کو دکان سے کوئی چیز نہیں دی تھی۔ لیکن نتھو سب کچھ دعوے سے لے لیتا تھا۔ وہ بیکار ہو کر سست ہو رہا تھا اور سست ہو کر اور بھی بے کار۔

ایک دن دکان پر ایک بیگم آئیں۔ انھوں نے دو تین مرتبہ اس انداز سے نتھو کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں یہ کون شہدا یہاں بٹھا رکھا ہے جس دکان میں عورتیں آئیں، اس میں ایسے مردوں کا کیا کام؟ مراری نے گھورتے ہوئے نتھو کو منع کیا۔ لیکن نتھو کہاں ماننے والا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی دکان میں دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اٹھ کر بیگم کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا۔

" یہ بٹی آپ کے رنگ پہ خوب کھلے گی —— واہ، واہ، واہ۔"

اور بیگم خوب لال چقندر ہوئیں۔ مراری جین نے بیگم کو بتایا کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے اور سیدھا سادا آدمی ہے۔ تب جا کر کہیں بات رفع دفع ہوئی۔ لیکن معاملہ بس اسی پر نہیں ہوا۔ اگلے روز ایک سردارنی صاحبہ تشریف لائیں۔ انھیں کوئی چیز دکھانے کے لیے حضرت بھی تشریف لے آئے اور بولے ——— "اگر آپ اسے پہنیں گی تو سردار جی بہت خوش ہوں گے سردارنی شرمائی، لجائی اور ہونٹھ نکالتے ہوئے بولی ——— "رنڈی چھڑ نا ——— (رانڈ چھوڑے)۔۔۔" اور پھر دوسری عورتوں کے ساتھ ہنسنے لگی۔ اب مراری کیا کر سکتا تھا ——— وہ نتھو سے تنگ آ چکا تھا۔ لیکن باقاعدہ مزاحمت کی اسے کبھی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ایک دن نتھو مراری جین کے پیسوں ہی سے ایک پیالہ خرید کر لاتا ہوا دکھائی دیا۔

"اس میں کیا ہے؟" مراری جین نے پوچھا۔"

نتھو نے کچھ جھینپتے اور کچھ دبدبہ دلیری سے کہا ——— "فسٹ کلاس ٹکّے ہیں۔"

مراری جین نہیں جانتا تھا یہ ٹکّے کیا بلا ہوتی ہے۔ لیکن جب اس نے جھک کر دیکھا تو اسے کباب تکّے اور گوشت کی کچھ بوٹیاں دکھائی دیں۔ مراری جین اس بات کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی دُکان میں گوشت آئے وہ مہاویر کا پجاری تھا۔ اس کے گورو ابھی تک ناک پر ایک سفید پٹّی رکھ کر آتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک جھاڑو سا ہوتا تھا اور جب کوئی کیڑا انھیں اپنے راستے پر نظر آتا تو اسے اس کی مدد سے ہٹا دیتے۔ وہ پانی بھی چھان کر پیتے تھے۔ اہنسا ان کا پرم دھرم تھا۔۔۔ مراری جین غصّہ سے کانپنے لگا۔ اس نے نتھو کو قریب آنے دیا تاکہ ایک ہی ٹھوکر سے پیالہ کو گرائے۔ لیکن وہ اپنے پانو سے بھی اس پیالہ کو چھونا نہیں چاہتا تھا۔۔۔

غصتہ سے کانپتے ہوئے اس نے کہا۔

"چلے جاؤ نتھو ــــــ آج سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ــــــ سُنا؟"

نتھو نے آنکھیں اوپر اٹھائیں، جھپکائیں۔ خفیف سی ہنسی ہنسا، گویا مذاق کر رہا ہے۔ لیکن مراری جین کے خدوخال بگڑے ہوئے تھے۔

"نکل جاؤ ــــــ مشٹنڈے ..... میں ایک پَل کے لیے بھی تمھیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا، سمجھے؟ چلے جاؤ نہیں تو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

نتھو نے پھر مراری جین کی طرف دیکھا۔ لیکن اسے اپنے کیے پر ذرا تاسف نہ ہوا۔

نتھو جانتا تھا کہ وہ اب کسی بھی کام کے قابل نہیں رہا۔ بالکل بے کار ہے، لیکن اس نے نتھو کی دھمکی نہ سہی . . . "تم سمجھتے ہو میرا خدا مر گیا ہے؟"

اور نتھو سامنے واچ میکر کے ساتھ خالی برآمدے پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ کھانے کے بعد اس نے کنوئیں کی ٹونٹی سے پانی پیا، اور مراری جین کی دُکان کے مقابل کھڑا ہو کر بولا ــــــ "تمھاری دُکان میں جو کچھ دکھائی دے رہا ہے، یہ سب میری بدولت ہے۔ اب دیکھوں گا تم کیسے پھولتے پھلتے ہو۔"

مراری جین نے بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جو پہلے غم و غصے سے کانپ رہا تھا اب خوف سے کانپنے لگا۔

چند دنوں کے بعد پھر تین چار کانسٹیبل، ایک حوالدار کی نگرانی میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ کوئی دکاندار کنٹرول نرخ سے زیادہ قیمت پر چیزیں نہیں بیچ

سکتا تھا۔ لیکن مراری جین نے خود چیزیں چور بازار سے خریدی تھیں۔ وہ کیسے کوئی چیز ارزاں دے دیتا۔ آخر ایک دن سپاہیٹا آیا اور بولا۔
حولدار پوچھتے ہیں "تمھارے پاس لیس فیتہ ہے؟"
مراری جین بالکل گھبرا گیا ـــــ اُسے پھر آسمان نیچے اور زمین اوپر نظر آنے لگی اس کا بچہ وائل کا ایک فراک پہنے، ایک کرسی پر بیٹھا اپنا دامن چبا رہا تھا۔ وہ لال پگڑی کی طرف دیکھ کر رونے لگا۔ مراری جین کو ایک لمحہ کے لیے نتھو یاد آیا۔ وہ ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ وہ اب تکیے سے واپس نہ آئے گا ـــــ نتھو اس کا دیوتا، جو اسے ہر بلا سے محفوظ رکھتا ہے ـــــ
سپاہیٹے کے دوبارہ سوال کرنے پر مراری نے کہہ دیا۔ "میرے پاس امریکن لیس کی دس گانٹھیں ہیں۔" اور حولدار نے چند گانٹھیں نکلوائیں، اور مقررنرخ پر خرید کر بہت سی دکانوں پر بکھیر دیں۔ قیمت خرید اور قیمت فروخت میں اتنا فرق تھا کہ شام تک مراری جین آٹھ تو سو روپے کا خسارہ اُٹھا چکا تھا ـــــ لیکن مراری کو اس خسارہ کی اتنی پرواہ نہ تھی۔ اس کے پاس اتنے پیسے ہو گئے تھے کہ دو چار مرتبہ وہ اتنا خسارہ برداشت کر لیتا۔ اسے صرف دو باتوں کا خیال تھا۔ پہلی تو یہ کہ مال جمع کرنے کا چالان نہ ہوا، اور دوسرا خیال اسے نتھو کا تھا ـــــ وہ نہیں جانتا تھا، اس کا بیٹا ایک سفید ململ کا فراک پہنے رو رہا ہے۔
اگلی صبح لوگوں نے دیکھا، مراری جین اور نتھو پھر چپل ہٹے کی طرف سے آرہے ہیں، نتھو کے ایک ہاتھ میں سُلفے کی چھوٹی چلم ہے۔ کندھے پر اوچھا ہے اور منہ کے قریب سے ایک چیتھڑا چلم کے نیچے لٹک رہا ہے نتھو نے آکر فاتحانہ انداز سے سر اوپر اٹھایا اور گوٹے اور افشاں کے اوپر دھواں چھوڑ دیا....

دُکان میں داخل ہوتے ہوئے پھر مراری نے کہا۔
"تم ناحق چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتے ہو نتھو"
نتھو نے کہا "چھوٹی بات ہے ———؟ میری پت تو اُتر ہی چلی تھی"
——— "نہیں بھائی میں مورکھ ہوں، آئندہ میرے ایسے کی باتوں کا خیال نہ رکھنا ———" اور یہ کہتے ہوئے مراری جین نے نتھو کے پانو پر ہاتھ رکھ دیے اور بولا:

"بابا تو کوئی پچھلے جگ کا سادھو مہاتما ہے۔ تو سب پاپ پن سے اوپر ہے ...... یہ جیو ہتیا مانس کھانا ہم دنیا داروں کے لیے پاپ ہے تمھارے لیے نہیں ...."

نتھو نے اپنے بائیں ہاتھ سے ناک کو دبایا۔ یہ ناک اور بھی پچک گئی تھی۔ یہ اسی طرح نیچے گر رہی تھی جیسے پانی کے قریب کچی دیوار زمین میں بیٹھ جاتی ہے۔ نتھو نے آتے ہی طلائی بانگڑی کی فرمایش کی۔ مراری ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے بانگڑی نتھو کو دے دی۔

نتھو کے آنے کے بعد دو عورتیں مراری کی مستقل گاہک بن گئی تھیں یہ ایک ہی شیخ صاحب کی دو بیگمات تھیں۔ بڑی بیگم چھوٹی کو داشتہ کہا کرتی تھیں چھوٹی بیگم بڑی کو 'اپنی جان' کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ چھوٹی بیگم کے ہاتھ میں نقد روپے پیسے ہوتے تھے اور وہ جتنا چاہے خرچ کر سکتی تھیں۔ لیکن بڑی کو نقد پیسے نہیں دیے جاتے تھے البتہ نواح کے دُکانداروں کو شیخ صاحب کا حکم تھا کہ بیگم جو چیز چاہیں، انھیں دے دیں ہر مہینے کی یکم کو حساب چکا دیا جائے گا۔ اس لیے بڑی بیگم ضد کے ساتھ چھوٹی سے زیادہ خرچ کرتی تھیں ....

اور مراری جین نے اپنے دو گاہکوں سے سینکڑوں روپے کمائے جس کے سامنے اس بانکڑی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ لوگ اب پھر نتھو کے خراٹے سنتے تھے اس سے پہلے نتھورات کو کہیں چلا جایا کرتا تھا لیکن اب اس میں چلنے کی سکت نہ تھی وہ سارا دن دُکان پر پڑا رہتا، اور لوبیاں، شکر قندی اور طرح طرح کی چیزوں کی فرمایش کیا کرتا ——— مراری جین کبھی خوشی سے اور کبھی طوعاً وکرہاً ان فرمایشوں کو پورا کرتا ——— وہ ہر روز صبح آتے ہی نتھو کے پانو چھوتا اور پھر کوئی کام کرتا ——— نتھو مراری جین کا دیوتا بن گیا تھا۔

گرمیوں کا موسم مندا رہا۔ آمدنی خاصی تھی لیکن تھم گئی تھی۔ اس پر نتھو کی فرمایشیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ وہ کتنا روپیا نتھو کو دے چکا تھا، ایک بات کا مراری جین کو یقین تھا نتھو چور نہیں ہے، جو لیتا ہے مانگ کر لیتا ہے۔ نتھو اب دُکان ہی میں سونے لگا تھا۔ وہ اب کہیں نہ جاتا تھا کہیں جانے کے اہل ہی نہیں تھا۔

ایک دن صبح مراری جین معمول سے جلدی دُکان پر آیا تو اسے دکان سے ایک عورت نکلتی دکھائی دی مراری جین نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ کون تھی نتھو؟ ——— " نتھو نے ہنستے ہوئے کہا "تم جانو، میں اب کہیں جانے کے قابل نہیں۔ اب یہی مجھ تک آجاتی ہے۔"

"یہ ہے کون؟" مراری نے پوچھا ——— "وہی ہے جس کے لیے میں بانکڑی وانکڑی لے جاتا ہوں جس کی چلم تکیے میں بھرتا رہا ہوں ——— "

مراری جین جی ہی جی میں رونے لگا ——— وہ کچھ دیر تک نتھو کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کسی خیال کے آنے سے اس نے جھک کر نتھو کے پانو کو ہاتھ لگایا اور جھاڑن سے دکان کے شیشے صاف کرتے ہوئے بولا:

"بابا، تو پاپ پُن سے پرے ہے۔"

کوکھ جلی

گھمنڈی نے زور زور سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔

گھمنڈی کی ماں اس وقت صرف اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ پہلے پہر کی نیند کے چوک جانے سے اب اسے سردیوں کی پہاڑ ایسی رات جاگ کر کاٹنا پڑے گی۔ چھت کے نیچے لاتعداد سرکنڈے گننے کے علاوہ ٹڈیوں کی اُداس اور پریشان کرنے والی آوازوں کو سننا ہوگا ——— دروازے پر زور زور کی دستک کے باوجود وہ کچھ دیر کھاٹ پر بیٹھی رہی۔ اس لیے نہیں کہ وہ سردی میں گھمنڈی کو باہر کھڑا کر کے اس کے گھر میں دیر سے آنے کی عادت کے خلاف آواز اٹھانا چاہتی تھی، بلکہ اس لیے کہ گھمنڈی اب آہی تو گیا ہے۔

یوں بھی بوڑھی ہونے کی وجہ سے اس پر ایک قسم کا خوشگوار آلکس، ایک میٹھی سی بے حسی چھائی رہتی تھی۔ وہ سونے اور جاگنے کے درمیان معلق رہتی۔ کچھ دیر بعد ماں خاموشی سے اٹھی پھر سے اوندھی لیٹ کر اس نے اپنے پاؤں چارپائی سے دوسری طرف لٹکائے اور گھسیٹ کر کھڑی ہوگئی۔ شمع دان کے قریب پہنچ کر اس

نے بتی کو او نچا کیا۔ پھر واپس آکر کھاٹ کے سانکھے میں چھپائی ہوئی ہلاس کی ڈبیا نکالی اور اطمینان سے دو چٹکیاں اپنے نتھنوں رکھ کر دو گہرے سانس لیے اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن تیسری دستک پر یوں معلوم ہوا جیسے کواڑ ٹوٹ کر زمین پر آرہیں گے۔

"ارے تھم جا۔ اُجڑ گئے" ماں نے برہم ہو کر کہا۔ "مجھے انتظار دکھاتا ہے اور آپ ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا"

کواڑ کے باہر گھمنڈی کے کانوں پر لپٹے ہوئے مفلر کو چیرتے ہوئے ماں کے یہ الفاظ گھمنڈی کے کانوں میں پہنچے ——"اُجڑ گئے....." ماں کی یہ گالی گھمنڈی کو بہت پسند تھی۔ ماں اپنے بیٹے کے بیاہ کا تذکرہ کرتی اور بیٹا بظاہر بے اعتنائی کا اظہار کرتا جب بھی وہ یہی گالی دیتی تھی۔ ایک پل میں گھر کو بسا دینے اور اُجاڑ دینے کا ماں کو خاص ملکہ تھا۔

اس طور پر اُتاؤلے ہونے کا گھمنڈی کو خود بھی افسوس ہوا۔ اس نے مفلر سے اپنے کان اچھی طرح ڈھانپ لیے اور جیب سے چُرائے ہوئے میکروپولو کا ٹکڑا سلگا کر کھڑا ہو گیا۔ شاید "آگ" سے قریب ہونے کا احساس اُسے بے پناہ سردی سے بچالے۔ پھر وہ میکروپولو کو ہوا میں گھما کر کنڈل بنانے لگا۔ یہ گھمنڈی کا محبوب مشغلہ تھا جس سے اس کی ماں اُسے "اوگن" بتایا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت کنڈل سے نہ صرف اُسے تسکین ملحوظ خاطر تھی، بلکہ ماں کے ان پیارے الفاظ کے خلاف ایک چھوٹی سی غیر محسوس بغاوت بھی۔

سگریٹ کا آوارہ جگنو ہوا میں گھومتا رہا۔ گھمنڈی اب ایک اور دستک دینا چاہتا تھا لیکن اُسے خود ہی اپنی احمقانہ حرکت پر ہنسی آ گئی۔ وہ لوگ بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ اس نے کہا، جو ہر مناسب اور نامناسب جگہ اپنا وقت

ضائع کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب انھیں کسی جگہ پہنچنا ہوتا ہے تو وقت کی ساری کسر سائیکل کے تیز چلانے، یا بھاگ بھاگ کر جان ہلکان کرنے میں لگا دیتے ہیں ـــــ اور یہ سوچتے ہوئے گھمنڈی نے سگریٹ کا ایک کش لگایا اور دروازہ کے ایک طرف نالی کے قریب دبک گیا۔

دھوبیوں کی کرٹڈی میں اُگا ہوا گوندنی کا درخت پچھوا کے سامنے جھک گیا تھا۔ جھکاؤ کی طرف، ٹہنیوں میں چاند کی ہلکی سی پھانک الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ماں نے ضرور آج گلے میں دوپٹہ ڈال کر دوپٹے کی پھوئیں ایکم کے چاند کی طرف پھینکے ہوں گے۔ اس کے بعد ایکا ایکی سائیں سائیں کی بھیانک سی آواز بلند ہوئی۔ ہوا، چاند کی پھانک اور گوندنی کا درخت مل جل کر اُسے ڈرانے والے ہی تھے کہ ماں نے دروازہ کھول دیا۔ . . .

"ماں . . . . ." گھمنڈی نے کہا اور خود دروازے سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس سے ایک لمحہ پہلے وہ اپنے دانتوں کو بھینچ رہا تھا۔

"آجا ـــــ" ماں نے کچھ رُکھائی سے کہا۔ اور پھر بولی۔ "آجا بھی اب ڈرتا کیوں ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، مجھے پتا نہیں چلے گا؟"

گھمنڈی کو ایک معمولی سا خیال آیا کہ ماں کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں ہے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"کس بات کا پتا نہیں چلے گا؟"

"ہوں ـــــ" ماں نے دیے کی بے بضاعت روشنی میں سر ہلاتے اور چڑاتے ہوئے کہا۔ "کس کا پتا نہیں چلے گا . . . . ."

گھمنڈی کو پتا چل گیا کہ ماں سے کسی بات کا چھپانا عبث ہے۔ ماں ـــــ جو چوبیس سال ایک شرابی کی بیوی رہی ہے . . . گھمنڈی کا باپ جب بھی

دروازے پر دستک دیا کرتا، ماں فوراً جان لیتی کہ آج اس کے مرد نے پی رکھی ہے۔ بلکہ دستک سے اُسے پینے کی مقدار کا بھی اندازہ ہو جاتا تھا۔ پھر گھمنڈی کا باپ بھی اسی طرح دبکے ہوئے داخل ہوتا۔ اسی طرح پھوا کے شوہر کو شرمندہ کرتے ہوئے . . . . اور یہی کوشش کرتا کہ چپکے سے سو جائے اور اس کی عورت کو پتا نہ چلے . . . . لیکن . . . . لیکن . . . . شراب کے متعلق گھمنڈی کے ماں باپ میں ایک اَن لکھا اور اَن کہا سمجھوتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ جاتے تھے۔ پینے کے بعد گھمنڈی کا باپ ایک بھی وافر لفظ منہ سے نہ نکالتا اور اس کی ماں اپنے مرد کو پینے کے متعلق کچھ بھی نہ جتاتی وہ چپکے سے کھانا نکال کر اس کے سرہانے رکھ دیتی اور سونے سے پہلے معمول کے خلاف پانی کا ایک بڑا کٹورہ چارپائی کے نیچے رکھ کر ڈھانپ دیتی . . . . صبح ہوتے ہی اپنے پلّو سے ایک آدھ سکّہ کھول کر گھمنڈی کی طرف پھینک دیتی اور کہتی :

" لے۔ ادھ بلویا لے آ —— !"

اور گھمنڈی اپنے باپ کے لیے شکر ڈلوا کر ادھ بلویا دہی لے آتا جسے پی کر وہ خوش ہوتا، روتا، توبہ کرتا اور پھر " ہاتھ سے جنت نہ گئی " کو جھٹلاتا . . . . . گھمنڈی نے ماں کے منہ سے یہ بات سُنی اور خفت کی ہنسی ہنس کر بولا :

" ماں . . . . ماں ! تُو کتنی اچھی ہے . . . . " پھر گھمنڈی کو ایک چکّر آیا۔ شراب پھوا کے جھونکوں سے اور بھی پُر اثر ہو گئی تھی۔ سگریٹ کا جگنو جو اپنی فاسفورس کھو چکا تھا، دور پھینک دیا گیا، اور ماں کا دامن پکڑتے ہوئے گھمنڈی بولا " اور لوگوں کی ماں ان کی بیوی ہوتی ہے لیکن تُو میری ماں ہی ماں ہے "

اور دونوں مل کر اس احمقانہ فقرے پر ہنسنے لگے۔ دراصل اس چھوکرے

کے ذہن میں بیوی کا نقشہ مختلف تھا۔ گھمنڈی سمجھتا تھا بیوی وہ عورت ہوتی ہے جو شراب پی کر گھر آئے ہوئے خاوند کی جوتوں سے تواضع کرتی ہے۔ کم از کم رولنگ ملز کے مستری کی بیوی جس کے تحت گھمنڈی شاگرد تھا اپنے شرابی شوہر سے ایسا ہی سلوک کیا کرتی تھی۔ اور اس قسم کے جوتی پیزار کے قصے آئے دن سننے میں آتے تھے۔ پھر کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کو اس قسم کی حرکت کرتے دیکھ کر اچھا سلوک نہیں کرتی تھی۔ بخلاف ان کے گھمنڈی کی ماں، ماں تھی۔ ایک وسیع و عریض دل کے مترادف جس کے دل کی پہنائیوں میں سب گناہ چھپ جاتے تھے . . . . اور اگر گھمنڈی کے اس بظاہر احمقانہ فقرے کی اندرونی صحت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کی متناقص شکل میں گھمنڈی کی ماں اپنے شوہر کی بھی ماں تھی۔

بستر پر دھم سے بیٹھتے ہوئے گھمنڈی نے اپنے ربڑ کے جوتے اُتارے یہ جوتے سردیوں میں برف اور گرمیوں میں انگارہ ہو جاتے تھے۔ لیکن ان جوتوں کو پہنے ہوئے کون کہہ سکتا تھا کہ گھمنڈی ننگے پاؤں گھوم رہا ہے . . . . گھمنڈی نے ہمیشہ کی طرح جوتے اُتار کر گرم کرنے کے لیے چولھے پر رکھ دیے۔ ماں پھر چلائی۔

” ہے، مرے تیری ماں بھگوان کرے سے . . . . ہے —— گور بھوگ لے توُ کو —— “

لیکن ہندو دھرم بھرشٹ ہوتا رہتا۔ ماں جوُتے اتار کر دُور کونے میں پھینک دیتی۔ پھر بکتی جھکتی اپنے دامن میں ایک چوتی باندھ گھمنڈی کے سرہانے پانی کا ایک بڑا سا کٹورہ رکھ، متعفن بستر کی آنتوں میں جا دبکتی۔

حد ہو گئی ــــــ ماں نے دو تین مرتبہ سوچا۔ گھمنڈی نے بنواری اور رسید کی سنگت چھوڑ دی ہے۔ اس نے گھمنڈی کو شراب پینے سے منع بھی نہیں کیا اور نہ اپنے اوباش سنگی سنگاتی کے ساتھ گھومنے سے ــــــ ماں نے سوچا شاید یہ نرمی کے برتاؤ کا اثر ہے۔ لیکن وہ ڈر گئی اور جلد جلد ہلاس کی چٹکیاں اپنے نتھنوں میں رکھنے لگی۔ اپنے آپ کو مارنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا۔ ہلاس سے اپنے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دینا .... لیکن اب ہلاس کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا تھا.... اسی نرمی سے ماں نے اپنے شوہر کا منہ بھی بند کر دیا تھا اس کی شخصیت کو کچل دیا تھا اور وہ بے چارہ کبھی اپنی عورت کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسی طرح گھمنڈی بھی اپنی ماں کے ساتھ ہم کلام ہونے سے گھبراتا تھا۔ ماں نے اس بات کو محسوس کیا اور پھر وہی ــــــ "تیری ماں مرے بھگوان کرے سے" ــــ لیکن اس بات کا اسے کوئی حل نہ سوجھ سکا۔

آج پھر چھ بجے شام گھمنڈی کارخانے سے لوٹ آیا۔ حالانکہ وہ نتھوا چوکیدار کی آواز کے ساتھ محلّے میں داخل ہوتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی پرانی تصویر دیکھنے چلا جاتا۔ وادیا کی مس نادیا کے گیت گاتا اور ایک دو سال سے اس کے پُر اسرار طریقے سے غائب ہو جانے کے متعلق سوچتا...... آج پھر اتنی جلدی لوٹ آنے سے ماں کے دل میں وسوسے پیدا ہوئے... .... اس نے بیکار ایک کام پیدا کرتے ہوئے کہا ــــــ

"لے تو بیٹا.... زیرہ لے آ تھوڑا...."

"زیرہ؟" گھمنڈی نے پوچھا "دہی کے لیے ماں؟"

"اور تو کا تمھارے سر پہ ڈالوں گی" ماں نے لاڈ سے کہا اور ضرورت سے

وافر پیسے دیتی ہوئی بولی: "لو یہ پیسے تھیٹر دیکھنا"
"میں سینما نہیں جاؤں گا ماں" گھمنڈی نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہی سیر تماشا تو ہم لوگوں کو خراب کرتا ہے"
ماں حیران ہو کر اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگی۔ ابھی خیر سے ہاتھ پاؤں بھی نہیں کھلے۔ اتنی دانش کی باتیں کرنے سے نجر لگ جائے گی رے .... "اور دراصل وہ اپنے بیٹے کو ایک شرابی دیکھنا چاہتی تھی۔ نہیں شرابی نہیں، شرابی سے کچھ کم جس سے تباہ حال نہ ہو جائے کوئی۔ لیکن یہ بھل منسیت بھی ماں کو راس نہ آتی تھی۔ اس نے کئی عقل مند بچے دیکھے تھے جو اپنی عمر کے لحاظ سے زیادہ عقلمندی کی باتیں کرتے تھے اور انھیں ایشور نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔
گھمنڈی زیرہ لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیسے لے کر دروازے تک پہنچا۔ مشکوک نگاہوں سے اس نے دروازہ کے باہر جھانکا۔ ایک قدم باہر رکھا پھر پیچھے کی جانب کھینچ لیا اور بولا "باہر چچی کھڑی ہے اور منشی بھی ہے"
"تو پھر کا؟" ماں نے تیوریوں کا ترشول بناتے ہوئے کہا:
"پھر کچھ ہے" گھمنڈی بولا "میں ان کے سامنے باہر نہیں جاؤں گا"
ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا "تو نے منشی کا کنٹھا اتار لیا ہے، جو باہر نہیں جاتا؟"
لیکن گھمنڈی باہر نہیں گیا۔ ماں منہ میں دوپٹہ ڈال کر کھڑی ہو گئی ماں منہ میں دوپٹہ اس وقت ڈالا کرتی تھی جب کہ وہ نہایت پریشان یا حیران ہوتی تھی۔ اور اپنے کلیجے میں مکّہ اس وقت مارا کرتی تھی جب کہ بہت غمگین ہوتی.... اس سے پہلے تو گھمنڈی کسی سے شرمایا نہیں تھا۔ وہ تو محلے کی لونڈیوں میں ڈنڈ پیلا کرتا تھا۔ عورتوں کے کوٹھوں پر سے بچے چھین لیتا اور

انھیں کھلاتا پھرتا۔ اور اسی اثنا میں عورتیں گھر کا دھندا کر لیتیں اور گھمنڈی کو دعائیں دیتیں....... اور آج وہ منشی اور بچی سے بھی جھینپنے لگا تھا۔

گھمنڈی نے واپس آتے ہوئے اپنے باپ کے زمانے کا خریدا ہوا ایک پھٹا پرانا موم جامہ نیچے بچھایا، اور ایک ٹوٹا ہوا شیشہ اور رال سامنے رکھ کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ ٹانگوں پر چند سخت سے پھوڑوں پر اس نے رال لگائی اور پھر شیشے کی مدد سے منہ پر رسنے والے پھوڑے سے پانی پونچھنے لگا اور پھر اس پر بھی مرہم لگا دی۔ ماں نے اپنی دھندلی آنکھوں سے منہ والے پھوڑے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ــــ "ہائے، کتنا کھون کھراب ہو گیا ہے تمھارا" ــــ اور پھر کر نجوا اور نیم کے نسخے گنانے لگی۔

اس وقت تک بہت رات ہو گئی تھی۔ رال لگانے کے بعد گھمنڈی موم جامے پر ہی دراز ہو گیا اور لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج ماں کو بھی جلدی سو جانے کا موقع تھا لیکن وہ اونچے مونڈھے پر جوں کی توں بیٹھی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ بستر میں جا دبکنے پر وہ نسبتاً بہتر رہے گی لیکن ایک خوشگوار تساہل نے اسے مونڈھے کے ساتھ جکڑے رکھا، اور وہیں سکڑ لی گئی۔ اس کا بڑھاپا اس میٹھی نیند کے مانند تھا جس میں پڑے ہوئے آدمی کو سردی لگتی ہو اور وہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر کلیجے سے لگاتا چلا جائے..... لیکن پائنیں میں پڑے ہوئے لحاف کو اٹھانے کے لیے ہل نہ سکے۔

ایکا ایکی ماں چونکی۔ اسے اپنے بیٹے کی خاموشی کا پتا چل گیا تھا اس نیم خوابی میں بڑے بڑے راز کھل جاتے ہیں۔ ماں نے کلیجے میں مارنے کے لیے مکا ہوا میں اٹھایا لیکن وہ وہیں کا وہیں رک گیا اور وہ پھر ایک حسین غشی میں کھو گئی۔ لیکن اسے گھمنڈی اور اس کے ساتھ اس کا باپ

یاد آتا رہا اور اس کی خشک آنکھوں میں داستانیں چھلکنے لگیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے دروازے کے پٹ کھل گئے اور ایک سرد بگولے کے ساتھ باہر سے گوندی اور بل کے پتے، گلی میں بکھرے ہوئے کاغذوں کے ساتھ اڑ کر اندر چلے آئے۔ ایک سوکھا ہوا بل کہیں سے لڑھکتا ہوا دہلیز میں اٹک گیا۔ گھمنڈی نے اٹھ کر دروازہ بند کرنا چاہا لیکن بل کو نکالے بغیر کامیابی نہ ہوئی۔

گوندی کے شور اور جھینگروں کی آواز نے ماں کے خون کو اور منجمد کر دیا۔ شمع دان میں دیے کا شعلہ اور متوازی ہو رہا تھا۔ گھمنڈی نے کہا "بستر پر لیٹے گی ماں؟" لیکن ماں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گھمنڈی نے سر ہلا کر ماں کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا اور جوں کا توں کھاٹ پر رکھ کر اوپر لحاف دے دیا۔ ماں کو خود پتا نہیں تھا کہ اگر وہ وہیں پڑی رہتی تو صبح تک سردی سے اکڑ جاتی۔ پھر وہ کبھی سیدھی نہ ہوتی اور وہیں ختم ہو جاتی۔ ماں کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شاید گھمنڈی نے کچھ بھی محسوس نہ کیا لیکن ماں نے بڑا حظ اٹھایا اور اس کے بعد لحاف کی گرمی و نرمی نے اس کو حظ اکبر* میں تبدیل کر دیا۔ کبھی ماں نے بیٹے کو گود میں اٹھایا تھا۔ ماں نے سوچا اور پھر ہلاس کی ایک چٹکی نتھنے میں رکھ کر اس نے زور سے سانس لیا۔ وہ حظ کی اس سطح پر آ چکی تھی جہاں مر کر انسان اس خوشی کو دوام کرنا چاہتا ہے۔ آج اس کے بیٹے نے اُسے گود میں اٹھایا تھا اور اُسے بستر کی قبر میں رکھ دیا تھا۔ وہ بستر جو قبر ہو نہ سکا......

دنیا میں کوئی عورت ماں کے سوا نہیں۔ اگر بیوی بھی کبھی ماں ہوتی ہے تو بیٹی بھی ماں..... تو دنیا میں ماں اور بیٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

عورت ماں ہے اور مرد بیٹا ... ماں کھلاتی ہے اور بیٹا کھاتا ہے .... ماں خالق ہے اور بیٹا تخلیق .... اس وقت وہاں ماں تھی اور بیٹا .... ماں بیٹا .... اور دنیا میں کچھ نہ تھا۔

ماں بدستور خواب اور بے خوابی کے درمیان معلق تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی لیکن اس کے تخیل کی شکلیں بے قاعدہ ہوکر خواب کے ایک اندھیرے جوہڑ میں ڈوب رہی تھیں۔ اس کے گاؤں کے چند مکان اس کی گلی میں آئے تھے لیکن کسی پُراسرار طریقے سے ان مکانوں کے پیچھے بھی وہی دھوبیوں کا محلہ آباد تھا۔ وہاں بھی وہی بل اور گوندی کے درخت —— سائیں سائیں کر رہے تھے —— اماوس کی رات کا جل ہو رہی تھی اور بیٹے کا چاند ان ظلمتوں کو پاش پاش کر رہا تھا۔ اس کا شوہر جسے وہ غلطی سے مرا ہوا تصور کرتی تھی، زندہ تھا اور اس سے صبح کے وقت "ادھ بلوئے" کی کٹوری مانگ رہا تھا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ ایک نہ پی ہوئی شراب کے نشے سے اسے بری طرح اعضا شکنی ہو رہی تھی لیکن اس کا خاوند تو مر چکا تھا مرے ہوئے آدمی کو کوئی چیز دینا گھر میں کسی اور متنفس کو خدا کے گھر بھیج دینے کے مترادف ہے لیکن وہ انکار نہ کرسکی۔ وہ بیوی تھی اور ماں۔ اس نے اپنے شوہر کے منہ کے ساتھ لگا ہوا کٹورہ چھین لیا۔ لیکن کیوں؟ اس کا شوہر مرا تھوڑے ہی تھا۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ وہی کٹا ہوا سا ہونٹ جس میں سونے کے کیل والا دانت دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں بھی اس دانت کو ڈھانپنے سے قاصر تھیں۔

دروازے پر دستک سنائی دی اور ماں کو محسوس ہوا، جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ایک غلاف سا اُترا لیکن

اس پر ایک اور غلاف تھا جو اس کے سارے بدن کا احاطہ کیے ہوئے تھا وہ پڑی رہی . . . . پڑی رہی . . . . اس کے پانو جو کچھ دیر پہلے سرد اور لکڑی کی طرح سخت تھے، کچھ گرم ہو گئے تھے، شاید گھمنڈی نے ہمیشہ کی طرح رگڑ رگڑ کر اس کے پانو گرم کیے تھے۔ ماں اپنے تخیل میں ہنسی . . . . گھمنڈی بھی اسے مرتا دیکھنا نہیں چاہتا۔ بیوی آجائے تو کچھ پتا نہیں . . . . لیکن اب اس گھن لگے ہوئے شریر کا کیا ہے؟ . . . ہلاس کدھر گئی . . . ماں سو گئی لیکن دروازے پر دستک کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی۔ بنواری اور رشید بھی پھر گھمنڈی کو بلانے آئے تھے۔ ماں کو ایک گونہ تسکین ہوئی گھمنڈی پھر ٹھیک ہو جائے گا لیکن صد گونہ اضطراب ہوا۔ ان کی سنگت پھر گھمنڈی کو بگاڑ دے گی اس وقت بڑھیا کو جاگ آئی ـــــ جاگتے ہی پہلی بات جو ماں کے ذہن میں آئی وہ اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے گھمنڈی کے باپ کو ادھ بلوئے کا کٹورہ منہ سے لگانے نہیں دیا۔ اگرچہ وہ کس قدر پیاسا تھا اور اس کا عضو عضو ٹوٹ رہا تھا اور وہ بڑی التجا آمیز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک گھونٹ بھی پی چکا تھا لیکن ماں نے سمجھنا چاہا کہ اس نے کچھ نہیں پیا اور وہ سمجھ گئی۔ اس نے دروازے میں کھڑے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور اس قدر دھیمی آواز میں کہا "میں صدقے لال" کہ وہ خود بھی اپنی آواز کو نہ سن سکی۔ اسی طرح اس نے ایک ان سنا بوسہ ہوا کی لہروں میں چھوڑ دیا۔

اپنی ماں کو سوتا دیکھ کر گھمنڈی باہر آگیا اور بولا۔

"میں سینما کے علاوہ اور کہیں نہیں جاؤں گا۔ یار کہے دیتا ہوں"

"نکل باہر سالے" رشید نے گالی بکتے ہوئے کہا "نکلتا ہے یا . . . ."

ماں کے دماغ میں ٹڈیوں اور جھینگروں کی آواز دوسری آوازوں کے ساتھ برابر آ رہی تھی۔ اگرچہ وہ قریب قریب سوئی ہوئی تھی، گھمنڈی نے باہر سے دروازہ بند کیا اور چلا گیا۔

کسی خیال کے آنے سے ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُسے پھر اپنا شوہر یاد آیا ——— اور بیٹا جو شکل اور عادات کے لحاظ سے اپنا باپ ہو رہا تھا لیکن کم سنی اور بلوغت کے درمیان ہی تھا چند ہی دنوں میں بالغ ہو جائے گا پھر اسے لگائی کی ضرورت ہو گی۔ ماں نے دل میں کہا۔ "مجھے پتا ہے اب گھمنڈی باہر کیوں نہیں جاتا"؟

ماں جانتی تھی گھمنڈی اپنے باپ سے زیادہ حسّاس واقع ہوا ہے جب وہ پی کر آئے تو اسے جتا دینا بڑی ہمور کھائی ہے۔ اور پھر اگلی صبح پلّو سے چونّی کھول کر دینا بھی تو ایک چپت ہے ——— چپت ——— چُپ چاپ چپت ——— شراب پی کر آئے ہوئے خاوند ——— بیٹے سے جوتی بیزار کرنا اور چونّی کھول کر دینا یا سرہانے کے قریب پانی کا کٹورہ رکھ دینا ایک ہی قسم کی بدسلوکی تو ہے۔ بلکہ یہ بات جوتی بیزار سے کہیں زیادہ دل آزار ہے اسی لیے گھمنڈی کے باپ نے اس کے سامنے کبھی آنکھ نہیں اٹھائی ...... باپ میں شخصیت کو کچل دینے کی وہی تو ذمہ دار تھی اور اب بیٹے کو مار رہی ہے .... ماں نے دل میں تہیّہ کیا کہ اب وہ کبھی اپنے پلّو میں دہی کے لیے چونّی نہیں باندھے گی اور نہ صراحی سرہانے کے قریب رکھے گی۔ اور وہ خود کڑھے گی لیکن بیٹے کو کچھ نہیں کہے گی .... اسے یہ پتا نہیں لگے گا کہ میری ماں سب کچھ جان گئی ہے .... گھمنڈی کے باپ کا بھی خیال تھا کہ اگر گھمنڈی کی ماں واویلا یا احتجاج کرتی تو اس وقت تو ضرور بُرا معلوم ہوتا

لیکن آخر میں کتنی آسانی رہتی۔ پہلے تو اس عادت سے خلاصی ہو جاتی۔ اور اگر یہ لت رہتی بھی تو اسی قدر شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اب جب کہ وہ خاموشی سے پانی کا کٹورہ سرہانے رکھ دیتی ہے اور جلدی جلدی ہلاس نتھنوں میں ڈالتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے .... شاید گھمنڈی اس تازیانے کی چوٹ نہ سہہ سکا تھا اور اس نے شراب پینا اور دیر سے گھر آنا ترک کر دیا تھا ——— خیر آج سے گھمنڈی پی کر آئے گا تو وہ کچھ نہیں سمجھے گی ——— کچھ نہیں کہے گی۔

رات کے گیارہ بجے ہوا کے جھونکوں اور گوندنی کے پتّوں کے ساتھ گھمنڈی بھی داخل ہوا۔ آج ہوا گھمنڈی سے زیادہ شور مچا رہی تھی ——— ماں بدستور چھت کی کڑیاں گن رہی تھی اور من ہی من میں کوئی بھولا بسرا بچھوڑا گا کر نیند کو بھگا رہی تھی۔ گھمنڈی نے آتے ہی دونوں ہاتھوں میں پھونک ماری۔ ہاتھوں کو رگڑا اور ماں کے پاؤں تھامتے ہوئے بولا۔

"ماں ———!"

اور ماں کو جاگتے ہوئے پا کر بولا:

"ارے! ——— تو سوئی نہ گئی ماں؟"

ماں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اب ان دیدوں میں نیند کہاں رے گھمنڈی!"

لیکن اس سے آگے وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ گھمنڈی بالکل ہوش میں باتیں کر رہا تھا۔ آج اس نے ایک قطرہ بھی تو نہیں پی تھی۔ اب جو ماں نے کچھ نہ سمجھنے کا تہیہ کیا تھا اس کا کیا ہوا؟ ——— ماں سچ مچ ہی کچھ نہ سمجھ سکی ——— وہ کچھ بھی نہ جان سکی۔

پت جھڑ جو ہونی تھی سو ہو چکی تھی۔ اس دفعہ پُروا کے آخری جھونکے اور تو کچھ نہ لائے ایک مہمان لیتے آئے۔ ماں نے گھمنڈی کو بلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! لے یہ چپنی بدل یا ——"

محلے میں چپنی بدلنے کی رسم خوب چلتی تھی۔ ماں پکی ہوئی سبزی پچی کے ہاں بھیج دیتی اور وہاں سے خالی برتن میں پکی ہوئی ترکاری آجاتی۔ اس تبادلے میں بڑی بچت تھی۔ دوسری سبزی بنانے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑتی تھی اور کھانے میں وہ بات پیدا ہو جاتی تھی۔ اور چچی سے چپنی چلتی بھی خوب تھی لیکن گھمنڈی نے یوں ہی کھڑے ایسا سر ہلاتے ہوئے کہہ دیا۔

"میں اب بڑا ہو گیا ہوں ماں —— میں کہیں نہیں جانے کا۔"

"لو ایک نئی مصیبت" ماں نے کہا اور خوش ہوتے ہوئے بولی "تو بڑا ہو گیا ہے تو کا؟"

اس وقت مہمان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ گھمنڈی نے موم جامہ جھلنگے کے قریب بچھا رکھا تھا اور اس پر وہی رال لگا رہا تھا۔ ان پھوڑوں کو آرام آتا تھا پر نہ آتا تھا۔ ماں نے دامن کی ہوا کرتے ہوئے رستے ہوئے پھوڑوں پر سے مکھیاں اُڑائیں اور بولی "تیرا تو کھون بالکل کھراب ہو گیا ہے۔"

اور دراصل گھمنڈی کا خون خراب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ دادا نے اسے پاک پوتر خون دیا تھا لیکن بیٹے نے خون میں تیزاب ڈال دیا اور خون پھٹ گیا۔ جسم بھی ساتھ پھٹنے لگا۔ کچھ مجرمانہ نگاہوں سے گھمنڈی نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "ماں! —— مجھے گرمی ہو گئی۔"

ماں کے سارے تیور سوال کی صورت میں اٹھ گئے۔ اور اس نے فقط اتنا کہا "کاہے؟"

گھمنڈی نے جھلنگے کی لٹکتی ہوئی رسیوں کو تھامتے ہوئے کہا۔ "یہ رشید کی کرتوت ہے!" اور بے اختیار روتے ہوئے بولا۔ "اس میں میرا کوئی قصور نہیں ماں!"

ماں نے ایک دفعہ پھر کہا "کاؤ!" اور گھمنڈی کی حدّت شعلہ بار ہو گئی اس نے ماں کو ایک گالی دینا چاہی لیکن وہ رُک گیا۔ گھمنڈی اب خود بھی چاہتا تھا کہ ماں کو اس کے آزار کا پتا چل جائے۔ بیٹے کو روتے دیکھ کر ماں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ روگ تو جی کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن اتنا خون خراب کبھی کسی کا نہیں ہوا۔۔۔ اور اس نے سوتے میں اپنے مرحوم خاوند کو ادھ بلویا پلا دیا تھا۔

مجبور ہو کر گھمنڈی پھر بلوغ، گمراہ بلوغ کی داستان رونے لگا۔ آج سے پچاس سال پہلے اس بلوغ کو زندگی کے درخت پر اس قدر پکنے نہیں دیا جاتا تھا کہ وہ سڑ کر اپنے آپ نیچے گر پڑے اور پھر دنیا جہان کو متعفن کر دے۔ ماں، جس کی شادی دس سال کی عمر میں ہو گئی تھی، اس بات کو نہیں جانتی تھی۔ جس طرح بدن کے علم سے ناواقف لوگوں کے لیے پیٹھ کا ہر حصّہ کمر ہوتا ہے، اسی طرح اس ناواقف، ناسمجھ اور نادان ماں کے لیے یہ خون کی خرابی، گرمی یا کوڑھ سے پرے کچھ نہیں تھی اور یہ سب کچھ کربجوا، نیم اور اسپغول کے "سحر" کے آگے نہ ٹھہر سکتا تھا

اب ماں "کاؤ" نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اگرچہ اسے کسی بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی جب سے گھمنڈی کا خون خراب ہوا ہے وہ بہت متلون ہو گیا ہے۔ گھر میں چیزیں بھوڑنے لگتا ہے اور جو بہت کچھ کہو تو اپنا سر فرش پر دے مارتا ہے۔

ماں خود ہی چینی بدلنے چلی گئی۔ گھمنڈی کی چچی نے اپنے ہاں پکی ہوئی ترکاری تو دے دی لیکن ان کے ہاں کی پکی ہوئی چیز قبول نہ کی۔ ماں کا ماتھا ٹھنکا دس سال سے وہ رنڈاپا اکیلی کاٹ رہی تھی اور اس نے کسی شریک کے

سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ آج جب کہ وہ کل کے تمام اسرار سے واقف ہو چکی تھی، بھلا کیوں جھک جاتی ؟ ماں اپنی دیورانی کے ساتھ جی کھول کر لڑی۔ دیورانی نے بھی دھتا بتایا اور کہا: "دیکھا ہے ہم نے اتنی بڑی ناک لیے پھرتی ہے تو بیٹے کو سنبھالا ہوتا، جو بازار میں جھک مارتا پھرتا ہے۔"

ماں ٹھیک کہتی تھی کہ "چینی بدلنے" سے گھمنڈی کا تعلق ؟ تو جو برتنا نہیں چاہتی تو یوں کہہ دے۔ لیکن دراصل ماں کو کوئی بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ خون خراب گھمنڈی کا ہوا ہے اور وہ گالیاں رشید اور بنواری کو دیتا ہے۔ دیورانی برتنا مجھ سے نہیں چاہتی اور صلواتیں گھمنڈی کو سناتی ہے۔

لیکن محلے کی دوسری عورتیں بھی ماں کو مطعون کرتی تھیں۔ ماں سخت پریشان ہو رہی تھی۔ آخر منشی جی سے لڑائی ہوئی۔ اس نے ڈانٹا کہ اگر گھمنڈی نے ہمارے مکان کے ارد گرد کہیں پیشاب کیا تو اس سے برا کوئی نہ ہوگا۔

آخر مہمان کے سمجھانے سے ماں کو پتا چل گیا۔ اس نے نہ صرف اپنا سر پیٹا بلکہ ایک دو ہتھڑ بیٹے کے بھی جما دیا۔ ہائے تو نے باپ دادا کا نام ڈبو دیا ہے رے! پڑوسن کے ساتھ پھر لڑائی ہوئی اور ماں نے کھری کھری سنا دیں: "حرام خور تجھے وہ دن یاد ہے جب تیری باہن حرام کروا کے نکلی تھی باوا کے گھر ..... نہ اندھا دیکھا تھا نہ کانا۔ کرنے کی تھی ..... اور وہاں جاکر گھڑا چھوڑ دیا تھا جانے کس کس کا گریب ایسر کے سر پہ! ——— اور گھر آکر ماں گھمنڈی کو کوسنے دیتی۔ گھمنڈی جب سب حکیموں سے مایوس ہوتا تو ماں کی حکمت میں آرام پاتا تھا ... لیکن ماں اسے گالیاں دیتی تھی ——— گور بھوگ لے تو کو۔" اب دنیا گھمنڈی کی آنکھوں میں آبلہ تھی۔ ایک بڑا آبلہ جو اُتر سے دکن اور پورب سے پچھم تک پھیلا ہوا تھا اور جس میں پیپ کے دریا رس رہے تھے۔

رات ہو گئی۔ ماں جھلنگے میں پڑی ابھی تک ٹھنک رہی تھی! "یہ بیماری کہاں سے مول لے لی رے میرے دشمن! سارا جسم پھوڑے ہو چکا ہے۔ یہ بیماری آگ ہے نری آگ۔ یہ امیروں کی دولت ہے۔ میں غریب عورت اس آگ کو کیسے بجھاؤں؟ ... میں ویدوں کو کیا بتاؤں؟ میں تمہاری ماں ہوں رے گھمنڈی! شریک مجھے طعنہ دیتے ہیں۔ پڑوسی مجھے کھڑا کر لیتے ہیں اور عجیب بے ڈھنگے سوال کرتے ہیں رے!"

گھمنڈی قریب پڑا ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیاز ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چھت میں لگے ہوئے نرکل اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے اور جھینگر اس کے دماغ میں بولنے لگے تھے۔ اب تک ہوا کے جھونکوں میں تلخی کی نمایاں رمق پیدا ہو کر اس کے جسم کے ایندھن میں اور شعلے پیدا کر رہی تھی۔ کواڑ بھی کھلے ہوئے تھے۔ گوندی سموم کے جھونکوں میں کراہ رہی تھی اور آسمان پر بدنما داغوں والا آتشک زدہ چاند اپنی برقانی نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ... اس کے بعد گھمنڈی کی آنکھوں میں پیٹ کی تخمیر نے ایک غیر مرئی دھند سی پھیلا دی۔ اس کی پلکیں بوجھل ہونا شروع ہوئیں۔ نرکل چھت پر چلے گئے۔ جھینگروں نے زبان بند کر لی۔ پھوڑے رسنے بند ہو گئے ...

سب دنیا سو رہی تھی لیکن ماں جاگ رہی تھی۔ اس نے بیس کے قریب ہلاس کی چٹکیاں نتھنوں میں رکھ لیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ دائیں ہاتھ سے اس نے دیا اٹھایا اور گھسٹتی ہوئی اپنے بیٹے کے پاس پہنچی آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔ گھمنڈی سویا ہوا تھا لیکن ماں کی شفقت اس کے روئیں روئیں میں تسکین پیدا کر رہی تھی۔ ماں نے بیٹے کی طرف دیکھا، مسکرائی اور بولی: "میں صدقے، میں واری ... دنیا جلتی ہے تو جلا کرے میرا لال جوان ہو گیا ہے نا؟ اسی لیے ... ہائے مرے تیری ماں بھگوان کرے ..."!

نامراد

صفدر، نقش بندوں کے ہاں کا بڑا لڑکا کالج سے گھر لوٹا تو کھانا کھا کر قیلولہ* کے لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں لکھی ہوئی خبریں پیٹ میں تخمیر* کے ساتھ دُھندلی ہوتی گئیں...... ہوتی گئیں... صفدر کو پتا تھا کہ وہ سو رہا ہے، اس کے اعضا ایک تفریح اور تفرج* کے قائل ہو رہے تھے۔ آپ* سے آپ یہ خیال بھی اس کے دماغ میں آیا کہ مرتے وقت بھی کچھ اس قسم کا عالم ہوتا ہے جسم کے اعضا تھک کر چور ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی تفریح اور تفرج کے قائل جس کا کوئی انجام نہیں۔ صفدر سو گیا لیکن وہ مرا نہیں....

تفرج کا احساس کہاں... ابھی اس کے اعضا نے تفریح بھی نہیں پائی تھی کہ اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں لیکن وہ کھل نہ سکیں۔ پلکوں کے لطیف پردوں میں خواب کی شاہراہیں —— شریانیں، شرابی ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں دبائیں اور کھولیں وہ اس منظر کے لیے تیار نہ تھا وہ اس خبر کے لیے تیار نہ تھا جو آج کے اخبار میں نہیں چھپی تھی۔

بڑے نقشبند —— امیر علی نقشبند، اس کے والد کھاٹ کے پاس کھڑے تھے اور قریب ہی ماں دروازے میں کھڑی کسی دکھ کے اظہار میں آنسو بہا رہی

تھی۔

"اُٹھ بیٹا۔۔۔ ارے اٹھ بھی، اس قدر غافل مت ہو"

غافل کا لفظ نقش بندوں کے ہاں کثرت سے استعمال ہوتا تھا۔ اور اس کے معانی بھی مختلف تھے، ان معانی سے مختلف جن میں ہم تم اور زید بکر اُسے استعمال کرتے ہیں۔ نقش بند تمام کے تمام بڑے متقی اور پرہیزگار لوگ تھے۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کی یاد کے علاوہ۔ جو وقت بھی گزرتا تھا غفلت میں گزرتا تھا۔ کھانا پینا، نصاب رٹنا، سینما دیکھنا، سونا، سب غفلت میں شمار ہوتا تھا۔ صفدر نے اپنے آپ اندازہ کر لیا کہ نماز کے متعلق کچھ کہتے ہوں گے اور وہ جی چرا کے سونے لگا۔ جب بڑے نقش بند نماز، تسبیح اور روزہ استغفار کے متعلق کچھ کہتے تو صفدر جگر کا ایک شعر پڑھ دیتا ؎

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

اس شعر میں انسان کے لیے کس قدر آزادی تھی وہ ثواب میں بھی آزاد تھا تو گناہ میں بھی آزاد، گناہ بھی عبادت تھی۔۔۔۔ پودوں کے ہوا سے سر ہلانے کا عالمگیر اثبات، پرندوں کے چہچہے، ستاروں کا ایک انجانے مرکز کے گرد طواف یہ سب کچھ عبادت تھی۔ جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہو رہی تھی۔ بڑی مچھلی کا چھوٹی مچھلی کو کھا لینا، انسان کا انسان کو کچل دینا، بطلان کا حق پر چھا جانا۔۔۔ یہ سب کچھ عبادت ہی تو تھی لیکن اگر وہ کاہل نہ ہوتا، اگر وہ سست نہ ہوتا تو اس کی عبادت مکمّل ہو جاتی، کیوں کہ ماں اور بڑے نقش بند بھی اس شعر کو کاہلی کا ایک جواز سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں زندگی کے دریا میں بہتا ہوا تنکا ایک ارادہ رکھتا تھا۔ چاہے کس قدر بے بضاعت

تھا وہ۔لیکن چند لہریں تھیں جو اس سے خوف کھاتی تھیں۔اس تنکے سے،اس پر کالا سے .... لیکن ماں کی سسکیاں ،یہ محض وہ غفلت نہ تھی،صفدر گویا بجلی کے کسی ننگے تار سے چھوگیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بڑے نقش بند نے متانت سے کہا "بیٹا! اُٹھ کپڑے بدل لے تمہارے سسرال سے بلاوا آیا ہے۔"

"میرے سسرال سے؟" صفدر نے حیرت سے پوچھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ماں ——!"

ماں نے اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا "نامراد! اُٹھ —— جا تجھے تیری خوش دامن نے بلایا ہے۔"

"نامراد" اور "خوش دامن" کے الفاظ کچھ عجیب طریقے سے استعمال کیے گئے تھے۔ وہ نامراد کا لفظ اس وقت کہا کرتی تھی جب وہ گودیں پڑے، خون تھوکے، کی معنوی حد سے ورے، بہت ورے محبت اور نفرت کی الجھنوں میں خفیف سی خفگی کا اظہار کرنا چاہتی تھی۔لیکن آج اس نے نامراد کچھ اس طرح کہا تھا جیسے اس کا بیٹا صفدر واقعی نامراد ہو.... اور اس کی منگیتر کی ماں کو وہ خوش دامن کے نام سے کم ہی پکارا کرتی تھی،وہ صرف رابعہ کی ماں کہہ دیتی تھی۔ صفدر کا ماتھا ٹھنکا۔آج خوش دامن کے لفظ پر زور دینے اور دہلیز پر کھڑے آنسو بہانے کی یہ وجہ تو نہیں کہ ماں کے ہاتھ سے خوشی کا دامن چھوٹ گیا ہے اور رابعہ کی ماں کے ہاتھ سے بھی؟

لیکن کیا مضائقہ ہے؟ صفدر نے پل بھر میں سوچ لیا۔اس نے اپنے ہاتھ سگریٹ کی طرف بڑھائے لیکن بڑے نقش بند کو دیکھ کر رک گیا۔ان کے سامنے سگریٹ پینا، گھر بدر ہونا تھا۔لیکن اپنی لاپروائی کا اظہار کسی طرح ممکن

نہیں تھا۔ صفدر نے جھک کے چارپائی کے نیچے سے بوٹ کٹوا کر بنائے ہوئے سلیپر نکالے اور انھیں پہن کر کھڑا ہو گیا اور اپنی ماں کی طرف خالی خولی نگاہوں سے دیکھنے لگا ـــــ "کیا رابعہ کی ماں نے کوئی اور رشتہ دیکھ لیا؟ . . . . یا . . . . ؟" وہ اپنے آپ کو فریب دینا چاہتا تھا . . . . بالفرض* محال اگر رابعہ، رابعہ بے چاری کو کچھ ہو گیا ہو تو پھر اسے بلانے کی کیا ضرورت ہے؟

نیچے زینے پر دھم دھم کی آوازیں آنے لگیں۔ سڑک پر کھلنے والی کھڑکی سے گھر کے زینہ کا آخری حصہ بھی نظر آتا تھا۔ گھر میں کون ہے، یہ دیکھنے کے لیے صفدر نے کھڑکی کو کھولا اور نیچے جھانکا ـــــ جمن تھا ـــــ رابعہ کا نوکر، شاید یہی وہ خبر لایا تھا جسے ایکا ایکی بتا دینے میں بڑے نقش بند اور اس کی ماں ایک قدرتی خوف کی وجہ سے تامل کر رہے تھے . . . . اس وقت ابھی دوپہر ڈھل رہی تھی کہ آسمان پر سلاروں کی قطاریں بڑے بڑے اور سست پروں کی طرح اڑنے لگیں۔ شہر کا دھواں گاڑھا ہو رہا تھا اور شہر کو پیش از وقت اندھیرے میں مبتلا کر رہا تھا۔

ماں ابھی تک کچھ بول نہ سکی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ پیدائش، شادی اور موت، تینوں موقعوں پر اپنے جذبات کو لفظوں* سے آسودہ نہیں کر سکتی تھی، بڑے نقش بند نے ارد گرد کوئی کرسی نہ دیکھی تو صراحی والی تپائی لے کر بیٹھ گئے جس پر سے عرصہ ہوا صراحی ہٹا دی گئی تھی۔ بولے ـــــ "بیٹا! یہ بڑی بری خبر ہے، تمھاری رابعہ چل بسی" ـــــ ماں نے اپنا منہ چھپا لیا اور پھر جلدی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھنے لگی . . . . . صفدر اس خبر کے لیے تیار نہ تھا لیکن اس نے حیرانی سے منہ کھول دینے کے علاوہ اور کچھ نہ کیا۔

نقش بند، زمانے کی دوڑ سے* بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ صفدر کو اس بات کا شدید گلہ تھا۔ اس لڑکی کے لیے اُسے کیسے افسوس ہو سکتا تھا جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہ رابعہ مر گئی ہے تو کیا ہوا؟ اسے صرف اس قدر افسوس ہوا جتنا کسی راہ چلتے کو میت مل جانے سے مرنے والے پر ہوتا ہے۔ شاید اس سے کچھ زیادہ۔ کیوں کہ رابعہ کا نام اب اس کے نام کے ساتھ لیا جاتا تھا اور اس کے کان رابعہ صفدر، صفدر رابعہ کی گردان سے مانوس ہو گئے تھے۔ جب پہلے پہل وامق عذرا، ہیر رانجھا، رومیو جولیٹ کے نام اکٹھے لیے گئے ہوں گے تو کانوں کو کس قدر ٹھیس پہنچی ہوگی لیکن اب یہ نام گھریلو بن گئے تھے —— روزمرہ* اسی طرح رابعہ اور صفدر کے نام روزمرہ تھے۔ آج رابعہ امتحان دے رہی ہے آج صفدر تصوّر کر رہا ہے۔... رابعہ کس قدر خوبصورت ہے اور اتنی اچھی صحت والی... صفدر... صفدر گورا چٹا ہے... رابعہ سُرخ بہت ہے اور اس پہ کچھ کھولائے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل...... صفدر کو کچھ رنج ہوا۔ اس نے سوچا صفدر رشیدہ، صفدر منوّر، صفدر نزہت... لیکن اس کے کانوں کو کچھ بُرا معلوم ہوا۔ اس نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"ابا جان مجھے افسوس ہے... لیکن میں جا کر کیا کروں گا؟"

اماں جان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "بیٹا یہ تو ٹھیک ہے، لیکن تمھاری رابعہ کی ماں نے خواہش ظاہر کی ہے؟"

صفدر کو لفظ "تمھاری" کے دُہرائے جانے پر جی ہی جی میں ہنسی آئی اس سے پہلے بھی وہ اس کی تھی لیکن کسی نے اس* طور پر اسے صفدر کے ساتھ منسوب نہیں کیا تھا۔ اب مر کر وہ اور بھی تمھاری ہو گئی تھی۔ اب جب کہ وہ در اصل کسی کی بھی نہ تھی۔ لیکن وہ مر کیسے گئی؟ یہ اب تک صفدر نے نہ

پوچھا تھا۔ درحقیقت، وہ اس خبر سے بھونچکا سا رہ گیا تھا لیکن نقش بندوں کے ہاں کی جھوٹی حیا کی خاطر اس نے حیرت کا اظہار نہ کیا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا:

"ہاں، کل تو مجھے اس کا بھائی ملا تھا..."

بڑے نقش بند نے اُٹھتے ہوئے کہا ——

"بیٹا صفدر! بے چاری اچانک چل بسی —— اچانک... اسے ایک خاص بیماری تھی"

اس خاص بیماری کے متعلق صفدر کچھ نہ پوچھ سکا۔ اس نے کپڑے اتارنے کے لیے کھونٹی کا رُخ کیا اور اس کے ہاتھ خود بخود لباس میں کالے عنصر والی چیزوں کی طرف اٹھ گئے... خاص بیماری؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں کو کئی قسم کی کہنے اور نہ کہنے کے لائق بیماریاں ہوتی ہیں۔ اس کے گھر میں خود اس کی ماں ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا رہتی ہے۔ گھر کے سب طاقچے شیشیوں سے بھرے رہتے تھے، جیسے اُسے کتابیں سجانے کا شوق تھا۔ اسی طرح اس کی ماں کو شیشیاں سجانے کا۔ لیکن دوسرے ڈاکٹر کے پاس جاتے وقت کوئی شیشی نہ ہوتی تھی اور بڑے نقش بند سٹپٹایا کرتے تھے۔ وہ جتنا ماں سے اس بیماری کے متعلق پوچھتا اتنا ہی اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا —— "پیٹ درد ہے —— سر دُکھ رہا ہے —— چھاتی پھُنک رہی ہے —— اُبکائیاں آرہی ہیں" وغیرہ —— اور اب اس نے عورتوں کی بیماریوں کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا —— وہ جانتا تھا کہ عورتوں میں برداشت کا مادّہ زیادہ ہوتا ہے اور وہ عام طور سے بیماریوں سے* بچ نکلتی ہیں... لیکن رابعہ مرگئی!

صفدر نے پوچھا "میت کب اٹھے گی میاں جی؟"
میاں جی نے جواب دیا "آٹھ بجے۔ اس سے پہلے نہ اٹھ سکے گی۔"
ماں نے کہا "ایک بھائی جالندھر میں دکان کرتا ہے اسے بھی تار دیا گیا ہے۔"
"آپ بھی شامل ہوں گے؟" صفدر نے پوچھا۔
"کسی پہ احسان تھوڑے ہے...."
صفدر نے اصرار کرتے ہوئے کہا "میاں جی میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔"
صفدر نے دیکھا۔ اس قسم کے سوال بڑے نقش بند کو کچھ درست نہیں معلوم ہو رہے ہیں، انھوں نے اپنے ہونٹ کاٹے اور کہا "تم میری بات مانو گے یا اپنی کہے جاؤ گے؟"
صفدر نے سر جھکا لیا۔ ماں دخل دیتے ہوئے نرمی سے بولی:
"بیٹا رابعہ کو تمھارے پہنچنے کے بعد نہلایا جائے گا۔"
اور ماں فرطِ غم سے رونے لگی۔ اس نے دیوار کے ساتھ اپنا سر مارتے ہوئے کہا:
"ہائے میری بیٹی۔ میں تجھے بہو بنا کر لائی اس گھر میں...."
صفدر کو اور بھی حیرت ہوئی لیکن وہ بغیر مزید سوال کیے چل دیا۔ سیڑھیاں اترتے ہی اُسے جمن مل گیا۔ جمن بڑی شدت سے صفدر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ روتا رہا ہے۔ صفدر نے کہا، "جمن!" لیکن جمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ صفدر کو دیکھ کر پھر سے رونے لگا۔ صفدر نے کہا "چلو ___" اور جمن روتا ہوا ساتھ ہو لیا

صفدر چلتا گیا اور سوچتا گیا ــــــ اس کے جانے کے بعد ہی رابعہ کو نہلایا جائے گا۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ رابعہ کے ہاں لوگ سخت پردے کے قائل تھے۔ آج اس کا اس گھر میں داخل کیسے ہوگا؟۔۔۔ اس گھر میں جس میں اسے داماد بن کر، سہرے باندھ کر داخل ہونا تھا۔۔۔ وہ اندر کیسے جائے گا؟ اس نے اپنی "تمہاری" کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ "نامراد" تھا۔ ماں اور خالہ کے کہنے کے مطابق رابعہ خوبصورت تھی، ہزاروں میں سے ایک لیکن اگر وہ شادی کے بعد بدصورت نکلتی تو وہ کیا کر لیتا؟ اس سے کسی نے پوچھا نہیں تھا ممکن ہے لوگ لمبوترہ چہرہ ناپسند کرتے ہوں۔ لیکن اُسے ایسا چہرہ پسند ہے، اور اس نے بچپن سے ہی ایک خاص قسم کے گوشوارے* اپنی دلہن کو پہنانے کا ارادہ کر رکھا ہے۔ جو لمبوترے چہرے پر اچھے دکھائی دیں۔۔۔

جمّن بڑی خاموشی سے سیلا کچیلا تولیہ کندھے پر ڈالے، ننگے پاؤں صفدر کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ صفدر بابو کے نقوشِ پا پر اپنے پاؤں رکھ کر چل رہا ہے لیکن صفدر نے اس مجروح جذبات والے فرماں بردار نوکر کو باتوں سے آزمانا نہ چاہا اور وہ چلتا گیا اسے دو سے تین فرلانگ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور بازاروں میں سے، جہاں بہت ہی شور و شغف تھا، گزرنا تھا۔۔۔ ممکن ہے رابعہ کو اپنا منگیتر یاد نہ ہوتا۔۔۔ اور صفدر نے اپنے گورے چٹے ہاتھوں کو دیکھا اور بازار میں چلتے ہوئے ایک بہانے سے سوڈا واٹر والی دُکان میں لگے ہوئے شیشے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بال سلجھے ہوئے نہیں تھے لیکن اس کے چہرے سے ایک حسین بے نیازی دکھائی دے رہی تھی جسے صفدر نے خود بھی محسوس کیا ــــــ لیکن یہ تو "عطار بگوید"* والی بات تھی۔۔۔ اس وقت

دوپہر شام میں ڈھل چکی تھی۔ کبوتروں نے اڑ اڑ کر تاروں پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک کبوتر نے ستم ظریفی* سے صفدر کے کوٹ پر بیٹ کر دی۔ جمّن نے دوڑ کر اسے تولیہ سے پونچھ دیا۔

"رہنے دو ــــ" صفدر نے کہا۔ "میں ایسی ہی ذلّت کے لیے پیدا ہوا ہوں ــــ"

وہمی صفدر نے یہ فقرہ یوں ہی کہہ دیا۔ لیکن اس سے جمّن کو بہت تسلی ہوئی اور وہ اب تک یہی سوچتا آرہا تھا کہ صفدر بابو کو رابعہ بی بی کے مرنے کا ذرا بھی افسوس نہیں لیکن صفدر اپنی گتھیاں* سلجھا رہا تھا ــــ اسے افسوس تھا لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکے اور دکھاوے کے لیے وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ عجب کیا جو اسے ناپسند کرتے ہوئے رابعہ نے کچھ کھا لیا ہو۔ اور خوف سے اس کا جسم اور روح کانپنے لگے ... شاید رابعہ کی ماں نے اپنی اسی حماقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اسے بلایا ہو لیکن ایسی باتیں کہنے کے لیے تو اسے دنیا کے ماں باپ کی طرف رجوع کرنا چاہیے تھا۔

ایک جگہ صفدر نے پیچھے مڑ کر جمّن کو پکارا۔

جمّن نے کہا "ہاں سرکار۔"

"بی بی کو کیا تکلیف تھی؟"

جمّن کا گلا رقّت* سے بھر آیا۔ اس نے کہا:

"بڑا جلم ہوا سرکار .... بڑا گھور جلم ہوا ــــ"

"رابعہ بی بی نے کھا لیا کچھ؟"

"ہے ہے ...؟"

جمّن نے دونوں ہاتھ ہلاتے اور کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"رابعہ بی بی ایسی نہ تھی صفدر بابو... اس ایسی نیک لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ تمھاری نوکرانی نے بتایا ہے"

"ہماری نوکرانی؟"

صفدر نے حیرت سے پوچھا اور پھر کہا:

"اچھا ____ تمھاری بیوی نے!"

جمّن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کنواری بی بی کے متعلق یہ بات کہنے لائق نہیں ہے۔ جو میں گناہ کرتا ہوں تو..." اور یہ کہتے ہوئے جمّن نے زمین پر سے مٹی چھوئی اور کانوں کو ہاتھ لگایا "تو اللہ بخش دے.... بی بی نہانے والی تھی کہ اس نے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا اور اس کے بعد وہ بالکل جڑ گئی...."

"نہانے والی تھی تو نہا لیا" صفدر نے حیرت سے پوچھا اور پھر سمجھتے ہوئے بولا "اوہ ____ ہاں ____ میں سمجھ گیا جمّن۔ اس میں گناہ کی کون سی بات ہے؟"

اور پھر دونوں خاموشی سے چلنے لگے۔ صفدر کا بلانا اس کے لیے اور بھی معمّہ بن گیا۔ اسے ایک گونہ تسلی ہوئی، کہ رابعہ اپنے منگیتر کی وجہ سے مایوس نہیں ہوئی۔ وہ اس قدر اچھی لڑکی تھی۔ اسی لیے وہ "نامراد" تھا۔ صفدر کو پھر محسوس ہوا کہ وہ رابعہ کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر رہا ہے... کوشش سے.... محنت سے.... دراصل اُسے اپنے آپ کو کچھ محسوس نہیں ہوتا شاید ماتم کدے میں پہنچ کر اس کا دل پسیج جائے لیکن اگر اس سے رویا نہ گیا تو بُری بات ہو گی اور اگر وہ رو دیا تو اور بھی بُری بات ہو گی۔

صفدر کے خیالات پیچھے کی طرف دوڑ گئے۔ جب رابعہ کی ماں لڑکا دیکھنے آئی تھی ——— جب اس نے صفدر کو دیکھا تھا ——— مجھے دیکھا تھا اور رابعہ کو کسی نے نہ پوچھا تھا۔ وہ خود رابعہ تھی ورنہ وہ کس طرح اسے پسند کر سکتی تھی؟ اس وقت وہ رابعہ کی ماں کا داماد نہیں تھا۔ وہ ایک لڑکا تھا، خوش شکل متناسب جسم والا۔۔۔ ایک مرد۔۔۔ اور رابعہ کی ماں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ رابعہ کے لیے یہ مناسب بر ہے۔ اس نے اپنے ذہن میں رابعہ اور صفدر کو اکٹھے کھڑے دیکھ لیا تھا ——— کیا اچھی جوڑی تھی۔ لیکن اس وقت رابعہ کہاں تھی؟ تخیل میں صفدر کے ساتھ کھڑی رابعہ کی ماں تھی، رابعہ نہیں تھی۔۔۔ اور صفدر کو ان فرسودہ رسموں سے نفرت تھی۔ کیوں نہیں اسے رابعہ کو دکھایا گیا؟ اور کیوں نہ رابعہ اُسے دکھائی گئی اب رابعہ مر چکی ہے اور وہ اس کے لیے کچھ بھی محسوس نہیں کر رہا۔ وہ کیوں ان کے دکھ درد میں شریک نہیں ہو سکتا؟۔۔۔ اب اُسے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ اُسے چڑانے کے لیے؟ ان پابندیوں پر آنسو بہانے کے لیے؟۔۔ سر پیٹنے کے لیے؟

"آفتاب منزل" کے سامنے پہنچ کر صفدر کھڑا ہو گیا۔ گھر میں خاموشی تھی ایک پُر اسرار قسم کی خاموشی، جو عام طور پر ماتم والے گھر میں نہیں ہوتی۔ شاید ماتم کرنے والے صبح سے رو رو کر نڈھال ہو چکے تھے۔ ان کے گلے سوکھ گئے تھے اور اب ان کے جسم کا رواں رواں رو رہا تھا۔ یہ خاموش رونا تھا، جو نالوں سے کہیں زیادہ تھا۔ دکھاوا تو تھا نہیں۔ جوان بیٹی دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے چلی گئی تھی۔ صفدر رک گیا۔ وہ خود حیران تھا کہ وہ اس گھر میں کس طرح داخل ہو رہا ہے۔ رابعہ کو بھی اس قسم کی تعلیم نہ دی

گئی تھی، جس سے وہ یہ حرکت نہ کرتی۔ وہ شرم و حیا کی پتلی، عفت اور پاکیزگی کا مجسمہ ایک جھوٹی شرم کا شکار ہو کر رہ گئی۔ کیا اس نے مرنے سے پہلے ایک بار بھی صفدر کے متعلق سوچا؟ ـــــ نہیں قطعاً نہیں۔ اسے کیا معلوم صفدر کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کا کوئی خیالی دولہا ہو گا جیسے ہر لڑکی کا ہوتا ہے۔ لیکن وہ صفدر نہیں ہو گا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔ ایسے ہی جیسے اس کی خیالی دلہن یقیناً رابعہ سے مختلف ہو گی اور وہ رابعہ کے لیے اسی طرح محسوس کرے گا جیسے اس نے کسی بھی مرنے والی لڑکی کے لیے محسوس کیا ہو۔ وہ اس گھر میں کیا استحقاق رکھتا ہے؟ وہ کیوں داخل ہو۔ اسے کیا حق ہے؟ ـــــ وہ آگے بڑھا۔ ٹھٹکا ـــــ بڑھا ـــــ اسے جمن کو بھیج کر بلایا گیا ہے....

رابعہ کی چھوٹی بہن قمر، جو منگنی میں بھی صفدر کے ہاں آئی تھی، دوڑی ہوئی باہر آ گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی "دولھا بھائی آ گئے"

صفدر نے اپنی طرف دیکھا۔ وہ دولھا بھائی تھا، کالے کپڑے پہن کر اپنی دلہن کو لینے آیا تھا.... اسے سب کچھ عجیب معلوم ہوا، ایک ڈھونگ ایک نیم سیاسی چال.... اسے یہاں کیوں بلایا گیا تھا؟.... رابعہ کا بھائی آیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کی قمیص کے بٹن کھل رہے تھے۔ شلوار کا ایک پائچہ اوپر نیفے میں تھا اور دوسرا زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ وہ مادّے کے احساس سے اوپر روح کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ روح جس نے جسم کا حلیہ بگاڑ دیا تھا، وہ چیخا اور اس نے صفدر کو بازو سے پکڑ لیا۔ گویا وہی ان کا مجرم تھا وہ بھی اسے دولھا بھائی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے نہ کہا۔ وہ فقط روتا رہا۔ بالغ آدمی کا رونا۔ جو ہر عمر کے انسان کے رونے سے زیادہ کریہہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ رونا نہیں چاہتا لیکن روتا ہے۔ پھر اس کے

چہرے کے تناؤ کسے جاتے ہیں اور وہ انھیں چھپاتا ہے۔

صفدر گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں برتن اور کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ رابعہ کی ماں بال بکھیرے بیٹھی تھی وہ جھول رہی تھی۔ فرطِ غم سے وہ ایک جگہ بیٹھ نہ سکتی تھی۔ وہ جیتی تھوڑے ہی تھی وہ مر چکی تھی رابعہ جیتی تھی۔ رابعہ کی ماں مر چکی تھی۔ صفدر کو دیکھتے ہوئے اس نے نہایت خوفناک آواز سے چلّانا شروع کیا۔ ایک بند دروازوں والے کمرے کے اندر سے بھی کسی بزرگ آدمی کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً یہ رابعہ کے باپ تھے، جو کسی کے سامنے رونا نہیں چاہتے تھے۔ اب صفدر کو رونے کے لیے کوشش کی ضرورت نہ تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

رابعہ کی ماں گم‌ بی پڑتی اٹھی اور وحشیانہ انداز سے صفدر کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولی "بیٹا! تو اس گھر میں سہرے باندھ کر آتا بیٹا میں تیرے شگن مناتی، میں تیرا سر چومتی لیکن میں رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔ اللہ کو میرا رونا منظور تھا... " صفدر کے سامنے ایک لاش ڈھکی پڑی تھی۔ ماں باپ، ساس سسر کے ارمانوں کی لاش —— رابعہ.... صفدر... صفدر کو رونے کے لیے کوئی بھی کوشش نہ کرنا پڑی۔ اس کے دل میں ایک اُبال سا آیا —— وقتی اُبال، جو شاید رابعہ کو سامنے پڑے دیکھ کر نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ارد گرد انسانیت کے دکھ درد کو دیکھ کر آیا تھا۔ رابعہ کی ماں نے کہا "بیٹا! تو کیوں روتا ہے؟"... لیکن رابعہ کی ماں نے اس کے رونے میں ایک خوشی، ایک تسکین سی محسوس کی۔ اگر وہ نہ روتا تو... صفدر کو رابعہ کی ماں نے آخر کس لیے بلایا تھا؟ رابعہ کی ماں نے کہا "بیٹا تو کیوں روتا ہے؟ تیرے لیے دلہنیں بہتیری۔ میرے لیے بیٹی نہیں کوئی۔ میری

رابعہ مجھے کہیں نہیں ملے گی۔" صفدر نے جی ہی جی میں غصّہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔" تمھارے اوہام! تمھاری جھوٹی حیا کا شکار لڑکی شاید اب تمھیں نہ ملے گی۔ شاید تم اس سے اس کھوٹے سکّے کے طلب گار نہ ہوگے.... تم لوگ ظالم ہو.... بے رحم.... میں ظالم ہوں، بے رحم اور سنگ دل.... شاید میں دل کی تہہ سے آنسو لاتا، لیکن اب رابعہ کون ہے؟.... یہ میری دُلہن نہیں...."

رابعہ کی ماں نے صفدر کو روتے دیکھا تو خاموش ہو گئی ـــــ نہ جانے کیوں خاموش ہو گئی اور پھر بولی:" بیٹا، تو مت رو۔ میں تیرے لیے دُلہن لاؤں گی۔ رابعہ سے بھی زیادہ خوبصورت ـــــ اس سے بھی زیادہ لمبے بالوں والی.... تیری روتی ہے بیزار.... لیکن میری بیٹی نامراد جا رہی ہے اس دُنیا سے۔ اسے ایک بار دیکھ لے۔ اس کی شادی یہی ہے کہ تو اسے ایک نظر دیکھ لے ـــــ دیکھ ـــــ دیکھ ـــــ دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی، نصیبوں جلے!"

صفدر اس بات کے لیے تیار نہ تھا، اسے اپنے ماحول سے نفرت ہو رہی تھی۔ ایک عجیب طرح کی ہمدردی آمیز نفرت، ان بکھرے ہوئے برتنوں ان پھٹے ہوئے کپڑوں، اس کفن ـــــ اس لاش ـــــ سے ایک قسم کی ہمدردی اور نفرت.... وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اُسے پورا بھروسہ تھا کہ اسے ناحق پریشان کیا جا رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ مرنے والی کی روح کو ناحق اذیّت دی جا رہی ہے۔ محض خود غرضی، محض اپنی آسودگی کے لیے وہ اس ماتم والے گھر میں اُس "دوسری لڑکی" کے متعلق کچھ بھی سُننے کے لیے اور پھر مرنے والی کی ماں کے منہ سے.... اسے حیرت

ہوئی.... لیکن وہ چُپ رہا.... وہ بھاگ نہ سکا۔ ایک خاص قسم کا تحیّر اس پر چھا گیا جو مُردے کو دیکھنے کے لیے ہر زندہ شخص پر چھا جاتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ڈر جائے گا لیکن وہ رابعہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے سہاگن بنانا چاہتا تھا۔ وہ نامراد تھی اور صفدر خود نامراد تھا۔ رابعہ کی ماں نے رابعہ کے مُنہ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ رابعہ خون کے کھولنے کی وجہ سے سیاہی مائل بتائی جاتی تھی لیکن اب اس کا خون کھول نہیں رہا تھا۔ اس کا خون سرد ہو گیا تھا، جم چکا تھا.... سُرخی اور زردی نے مل کر ایک عجیب قسم کی سفیدی پیدا کر دی تھی۔ ہوا میں اس کے بالوں کی ہلتی ہوئی لٹ سے اس کے زندہ ہونے کا گمان ہوتا تھا ـــــ وہ کس قدر خوبصورت تھی ـــــ موت میں اور بھی حسین ہو گئی تھی ـــــ اس کا لمبوترہ چہرہ جس پر صفدر کے تخیّل میں بسے ہوئے گوشوارے کتنے مناسب دکھائی دیں.... لیکن وہ سب غیر مانوس تھا۔ وہ اس گھر کا دولھا تھا، لیکن ایک اجنبی تھا... اور پھر ایک دولھا! ـــــ رابعہ کی ماں اسے کوئی کم درجہ دینے کو تیار نہ تھی۔ اس نے ایک بار پھر چلّاتے ہوئے کہا

"صفدر بیٹا! دیکھ میں تجھے کیا دے رہی تھی ـــــ میری بیٹی نامراد جا رہی ہے۔ نہیں، میری بیٹی نامراد نہیں ہے ـــــ صفدر!...؟"

صفدر نے پھر ایک دفعہ بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پاؤں زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ اس کا دماغ چکرا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رابعہ نامراد ہے یا وہ خود۔ صفدر ـــــ جو دونوں ایک دوسرے سے نامحرم ہیں۔ یا رابعہ کی ماں نامراد ہے۔ جو دونوں کو جانتی ہے!

جب میں چھوٹا تھا

ان دنوں ہم جہانگیر آباد میں رہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کا وہاں ایک پُرانا لیکن بہت بڑا مکان تھا جسے ہم پرتھوی بَل کہا کرتے تھے۔ پرتھوی بَل زمین کی طاقت ہر جگہ بالعموم یکساں ہوتی ہے، لیکن شہر کی مٹی میں ہمیں وہ طاقت نہیں ملتی جو پرتھوی بل میں میسّر آتی تھی۔ وہاں کی کشش ثقل ایک چیز ہی علاحدہ تھی۔

قدرت کی ہر اچھی چیز پرتھوی بل کے عین قریب مل جاتی تھی۔ ابھی کروندے کا خیال آیا۔ باہر آکر دیکھا تو۔ بوادتا اچارج جو پھل بیچنے کے علاوہ مر جانے والوں کی آخری رسوم ادا کرتا ہے، کروندے اور سنگھاڑے بیچ رہا ہے۔ اگر آڑو یا، کمرکھ کے متعلق سوچا تو وہ باہر موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے ہماری سوچ چند ایک کھٹے میٹھے پھلوں اور چند ایک لغو قسم کے کھلونوں تک محدود ہو، تاہم سب کچھ ہم تک اپنے آپ کھنچا چلا آتا تھا۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی جس کے دونوں کناروں پر ایک ذخیرہ تھا۔ ہماری کہانیوں کے جن، دیو اور پریاں سب اس چھوٹے سے ذخیرے میں رہا کرتی تھیں۔ ہماری نگاہ ہمیشہ اس ذخیرے میں اُلجھ

جاتی تھی اور جس طرح گھر کر آتے ہوئے بادلوں میں بچے کو اپنی مرضی کی شبیہہ مل جاتی ہے اسی طرح اس ذخیرے کی ہر شاخ، ہر پتہ ہمارے دل کی کہانی بن جاتا تھا۔ جب ہم بچے پرتھوی بل کے کھلے آنگن میں کبڈی، بارہ گٹال اور شاہ شٹاپو کھیلتے ہوئے تھک جاتے اور دماغ ایک نیا کھیل ایجاد کر لینے سے عاجز آجاتا، تو ہم ندی میں نہانے کے لیے چلے جاتے۔ حالانکہ وہاں جانا منع تھا——— لیکن تمام ممنوعہ چیزوں کو آزمانا مثلاً سلائی کی مشین کی ہتھی کو گھمانا، عشق پیچاں کو قینچی سے کاٹ ڈالنا ہمارا محبوب ترین شغل تھا....

کسی نے کہا ہے چھ سال کی عمر میں بچوں کے جسم خوراک سے اور دل تجربہ سے بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کا تخیل، ان کا شعور، مکاشفے سے بڑھتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ نصیحت ان کے لیے بالکل بے معنی ہوتی ہے۔ ان کے شعور کے کسی کونے میں بھک سے اڑ جانے والا ایک جذباتی مادہ ہوتا ہے جسے معمولی طور پر چھو دینے سے ان کا تصور ایک نیا رنگ ایک نئی حد یا دونوں وضع کر لیا کرتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب امڈ آتے ہیں.. ... ان کے سپنوں کے رنگ چند نہ مٹنے والے نقوش اختیار کر لیتے ہیں...

باوا لوگوں کے اس بڑے کنبے میں سب سے چھوٹا میں تھا۔ جب میں چھ برس کا تھا تو میرے والد کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہو گی میرے والد کو نزلے کی دیرینہ شکایت تھی۔ وہ کچھ گنگنا کر بولتے تھے۔ ان کا دماغ آسانی سے خوشبو یا بدبو میں تمیز نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی ان کی باتوں پر لوگ منہ پھیر کر ہنس دیتے تھے۔ میں ہنستا بھی تھا اور افسوس بھی کرتا تھا۔

بو باس کے دماغ میں نہ سمانے پر اکثر انھیں خود بھی اپنے آپ پر رحم آیا کرتا تھا۔ نزلے کی وجہ سے ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ جسمانی لحاظ سے کافی تنومند تھے۔ بیساکھی کے ارد گرد ہمارے گاؤں میں کسی نہ کسی کے ہاں ضرور بچہ پیدا ہو جایا کرتا تھا اور وہ اپنے بچے کا نام رکھوانے کے لیے میرے والد کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور والد صاحب بچے کا نام عمر دین، خیر دین، نانک چند اور فاطمہ وغیرہ رکھ دیا کرتے تھے اور سب لوگوں کو وہ نام قبول ہوتا تھا۔ یہ نام اکثر بیساکھی کے روز رکھا جاتا تھا اور شیرینی بانٹی جاتی تھی۔ بیساکھی کی ہوا جو گندم کو اس کے خوشے سے الگ کرتی ہے ان کی نرم، ملائم اور سفید ڈاڑھی کو دو حصوں میں بانٹ کر دونوں شانوں پر پھینک دیتی تھی ——— اور یہ نظارہ ہمارے دل میں ایک قسم کی ٹھنڈک اور پاکیزگی پیدا کرتا تھا۔

میرے والد کنبہ کے سب بچوں کو اکٹھا کر لیا کرتے تھے۔ اور ان کے شور و غل سے بچنے کے لیے انھیں کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان کی کہانی عام طور پر ان کی زندگی کے کسی خاص واقعہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ کہانی عموماً یوں شروع ہوتی تھی۔

"جب میں چھوٹا تھا تو . . . "

میرے خیال میں بہت سے ماں باپ اور بہت سے بزرگ اپنے بچوں کو کہانی سناتے ہوئے اس فقرے سے شروع ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا تھا یا چھوٹی تھی . . . . اور انجام کار یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ بچپن ہی سے مضبوط ارادے کے مالک تھے اور سچائی کے پتلے تھے۔ انھوں نے کبھی شرم و حیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولے اور

بڑوں کے سامنے کبھی گستاخی سے پیش نہیں آئے۔ ان کے اخلاق کی بڑائی ان کی بچپنے کی ہر حرکت سے ظاہر تھی۔ ایسی باتیں سن کر میرا جی بھی یہی چاہتا کہ ان کی مانند نیک بن جاؤں —— یہی میرا مطمح نظر تھا —— مجھے اپنے والد ایک بہت بڑی شخصیت دکھائی دیتے تھے یا دوسرے لفظوں میں وہ ایک عظیم طاقت تھے، جس سے ضلع کا بڑے سے بڑا حاکم بھی انکار نہیں کرسکتا تھا۔ جہانگیر آباد کے سب آدمی ان کے سامنے تعظیماً سر جھکا دیتے تھے اور "بڑے بابا" کے سوا انھیں اور کسی لقب سے یاد نہیں کرتے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ میرے ہی باپ ہیں۔ لیکن وہ ایک تقدس مآب بزرگ ہونے کی حیثیت سے قصبہ کے سب لوگوں کے باپ —— ایک پتاما دکھائی دیتے تھے، جیسے خدا کل عالم کا باپ اور ایک پتاما ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میرے والد نے خود ہی ایک عام پدرانہ سی پُر شفقت روش اختیار کر رکھی تھی۔ کسی چھوٹے کے نزدیک آنے سے ان کا دایاں ہاتھ اپنے آپ آشیرواد کے لیے اٹھ جاتا تھا۔ یہ کس قدر ظلم تھا کہ اس عام پدرانہ روش میں پہلے جان بوجھ کر اور پھر عادتاً انھوں نے اپنے بہت قدرتی رجحانات اور جانب دارانہ جذبات اور خیالات کو کچل دیا تھا۔

ان کے بچپنے کی ایک کہانی ہم سب بچوں کو بہت بھاتی تھی۔ ہم بہت سے بچے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پرتھوی بل کے کھلے صحن میں بیٹھ جاتے اور اپنے بزرگ کی ایک ہی کہانی، ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بار بار دُہراتے۔ یہ بات بہت ضروری تھی کہ بالمکند کہانی کہے تو اسی انداز میں

آنکھیں مٹکا کر اور چٹکی بجا کر، اور شانتی وہ کہانی دُہرائے تو ویسے ہی آنکھیں مٹکا کر اور چٹکی بجا کر۔ میرے والد کی کہانی، ہم سب بچوں کو اسکول کے پہاڑوں کی طرح ازبر یاد، اور باسی روٹی کی طرح مرغوب تھی۔ اگر میں اس کہانی کا ایک لفظ بھی بدل دیتا تو باقی بچوں کے نزدیک کوئی بہت بڑا جرم کرتا۔ اس وقت میرے چچیرے بھائی اور پھوپھیری بہنیں فوراً احتجاج کے لیے اٹھ کھڑی ہوتیں وہ کہانی چوہوں کے متعلق تھی اور ایک طرح سے ہمارے خاندان میں گیت بن چکی تھی۔

کہانی یوں تھی:

جب میرے بابا اور چچا دیوا چھوٹے ہوتے تھے، تو ان کے دل میں چوہے پکڑنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بڑے سے دیو صورت پرتھوی بل کی جگہ ان دنوں ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان ہوتا تھا جس میں چوہوں کے بڑے بڑے بل تھے۔ چوہے ہر روز پنیر کی ٹکیہ یا بابا کی مرغوب باسی روٹیاں لے جایا کرتے۔ چچا دیوا نے ایک پنجرہ لگایا۔ سب چوہے پھنس گئے۔ ایک چوہا بھاگ کر سُرنگ میں گھس گیا ——— اب آپ کو یہ جاننا چاہیے (بچے اس بات کے نہ دُہرائے جانے کو کبھی برداشت نہیں کرتے تھے) سرنگ ایک بڑا لمبا چوڑا بل ہوتا ہے جس میں سے چوہے گزر کر ذخیرے اور ذخیرے سے واپس اپنے مکان میں آجاتے ہیں .... بابا نے ایک پنجرے کو سرنگ کے منہ پر رکھ کر اسے شہتوت اور کروندے، توڑیے کے گودے اور بئے کے گھونسلے سے ڈھک دیا۔ اگلی صبح چچا دیوا کی ہمت نہ پڑی کہ وہ پنجرے تک چلے جائیں اس لیے بابا اکیلے ہی گئے ——— اکیلے!

(دُہراتے ہوئے) بابا ایک چھوٹے سے بچے تھے۔

انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پنجرے پر سے پتے ہٹائے تو کیا دیکھتے ہیں وہ ــــــ وہاں ایک چوہا تھا۔ شتری رنگ کا، پورے قد کا مٹکتا ہوا اور لٹکتا ہوا پٹخنا ہوا اور بھٹکتا ہوا ؟

"بابا اتنے گھبرائے، اتنے گھبرائے کہ جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے۔ (ہمارے لیے کہانی کا یہ حصّہ سب سے زیادہ سنسنی پیدا کرنے والا تھا) "جوتوں سمیت دوڑتے ہوئے چوکے میں چلے گئے"۔

وہ بھاگ کر آئے اور چچا دیوا کو آواز دی ــــــ دیوا ہو دیوا۔ دیوا ہو۔ اور آواز دیتے ہوئے وہ دونوں ہاتھ اپنے منہ کے دونوں طرف رکھ لیتے تاکہ آواز اِدھر اُدھر بکھرنے نہ پائے اور آواز سیدھی چچا دیوا تک پہنچے۔ پھر وہ اتنی زور سے چلائے کہ آواز ایک چیخ میں بدل گئی۔ پھر چیخ کھانسی کی صورت اختیار کر گئی۔ کھوں کھوں کھونہہ! پھر بابا اور چچا دیوا مل کر سرنگ تک چلے گئے ــــــ جوتے پہنے ہوئے! اُن کے ہاتھ میں شہتوت کے دو بڑے بڑے موگرے تھے بابا نے چوہے کو مار دیا۔ بالکل مار دیا، اور جہانگیر آباد کے چنڈالوں سے چوہے کی کھال کھنچوا کر اسے چھت پر رکھ دیا۔ جب کھال سوکھ گئی تو پھر انھوں نے اسے بھیکو چنڈال کے ہاتھ بیچ دیا۔ بھیکو نے اسے کسی اور کے ہاتھ بیچا۔ اس نے کسی اور کے ہاتھ . . . اور ایک آدمی نے اس کی فر بنا دی۔ آج کل بڑی بھابی کے سوئٹر کو وہی فر لگی ہوئی ہے"۔

اب معاملہ برداشت کی حد سے بڑھ جاتا۔ سب بچے جھوٹ جھوٹ بکواس بالکل بکواس کا شور مچا دیتے۔ یہ ممکن نہیں کہ موٹی جرنیل بھابی کے خوبصورت سوئٹر کو ایک ذلیل چوہے کی فر لگی ہے۔

آپ نے دیکھا۔ اس واقعہ میں کوئی اصلاح کا پہلو نہیں ہے۔ اپنے والد کی

زندگی کا یہی ایک واقعہ تھا جس سے ان کی کمزوری کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ خود کتنے ڈرپوک تھے۔ حالانکہ ہمیں ہمیشہ بہادر بننے کی تلقین کرتے تھے۔ بچوں کی ذہنی نشوونما کے لیے اس قسم کے واقعات نام نہاد ادب، تمیز اور دوسری نصیحت سے پٹی ہوئی کہانیوں سے زیادہ موثر ہوتے تھے۔ ان سے ہمیں حقیقت کا پتا چلتا تھا اور ہماری سمجھ میں آتا تھا کہ ہمارے بزرگ بھی کبھی بچے تھے۔ ورنہ دوسری طرز کی کہانیوں میں وہ بچے کی جگہ ہمیں بوڑھے ہی نظر آتے تھے۔ گویا وہ ناف تک پہنچتی ہوئی داڑھی بچپن ہی سے ان کی ٹھوڑی پر موجود تھی۔

شرارت، لاعلمی ایک قسم کی زندگی ہے جس سے بچے پھلتے پھولتے ہیں۔ قدرت ان چیزوں کو بچوں کی جبلّت میں دے کر انھیں بڑھاتی ہے۔ ہم نے اپنے ارتقا میں دیکھا ہے کہ عقل اور علم و ادب کے پیدا ہونے کے بعد جسمانی اور روحانی ترقی رک جاتی ہے۔ بچوں کو عقل اور علم کی ضرورت ہے۔ مگر اسے آہستہ آہستہ گویا ہکا شفنے کے طور پر آنا چاہیے نہ کہ اسے جھوٹ سچ، طور بے طور اُن پر ٹھونسا جائے۔ ان کی زندگی میں سلائی کی ہتھی کو گھمانا، بلا اجازت ندی میں نہانا، عشق پیچاں کو جڑ سے کاٹ دینا اور اس قسم کے سیکڑوں حادثات پیش آتے ہیں، جن سے ان کو تنبیہہ کی جاتی ہے۔ ان کی جبلّت کو دبایا جاتا ہے۔ لیکن کیا وہ دب جاتی ہے؟ اور اگر دب جاتی ہے تو کیا اسے دبا کر خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے؟

سردیوں کی ایک صبح کو بالمکند نے ایک گھوڑے کو تھان پر سے کھول دیا۔ بابا اسے پکڑنے کے لیے کھیتوں کے اونچ نیچ میں دوڑے ان کی داڑھی اڑ رہی تھی۔ ان کی سُرخ نوک دار ناک سے پانی بہہ رہا تھا کیا اچھا نظارہ تھا ـــــــ اور اس سے ایک دن پہلے ہم سب آٹے کی چڑیاں بنانے

کے جُرم میں پٹ چکے تھے۔

آخر ہمارے اخلاق کو بہتر بنانے اور ہماری عادتوں کو سنوارنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک استاد رکھ دیا جو سوائے ہمارے باقی سب کی عزت کرتا تھا۔ ہمارے استاد نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ہم میں سب سے زیادہ متابعت کرنے والے لڑکے کو "باادب باتمیز" کا سُرخ نشان دے دیا جاتا تھا۔ اس جدّت سے ہم بہت متاثر ہوئے لیکن درحقیقت اس امتیازی نشان نے ہماری ذہنیت کو اس طرح غلام بنا دیا جیسے سرکار ہمارے کسی قومی بھائی کو دیوان بہادر یا خان بہادر بنا کر اس کے ہاتھ پاؤں کو حرکت اور آزادی کی زندگی کے عمل سے روک دیتی ہے۔

اس قسم کے اعزاز پانے والے لڑکے کو ہم بڑے رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اکثر "باادب باتمیز" کے الفاظ میں سے "ادب" اور "تمیز" کے دونوں الفاظ حذف کر کے ایک بکری کے بچے کی طرح ..... با ... با ..... ممیانے لگتے۔ اگرچہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہماری اس قسم کی حرکت میں انگور کھٹے ہیں کا جذبہ کارفرما ہوتا تھا اور حقیقت اور آزادی کا تجسّس کم تھا۔

بہار کے موسمی اعتدال نے آہستہ آہستہ اپنی میانہ روی چھوڑ دی اور اس کی خوش خلقی میں تلخ مزاجی بڑھنے لگی۔ یہ وہ دن تھے جب شہتوت کی کونپلیں پورے طور پر پھوٹ نکلتی ہیں اور اس میں پھل پیدا ہو کر راہ رو کو للچاتے ہیں اور چنار کے چوڑے پتے اپنی گھنی چھاؤں سے ماں کی گود کا سا سکون دیتے ہیں۔ لمبی لمبی توریوں، اس کے اردگرد کے پھول پتّوں میں زندگی کی پگمنٹس اور کلوروفل کی صورت میں دوڑ جاتی ہے۔

ایسی ہی ایک شام میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا۔ مجھے بھی وہ امتیازی نشان دے دیا گیا۔ اس وقت مجھے اپنے ہجولیوں کا ممیانا اور مجھ پر ایک طرح کی غداری کا الزام لگانا بہت بُرا لگا۔ اسی بہار اور گرمی کے درمیان موسم میں ایک دن پرتھوی بل کی چھت پر جا چڑھا۔ وہاں ایک چھجہ تھا جس کے ایک کونے پر کھڑے ہونے سے سامنے کا نباتاتی ٹیلا اور شور مچاتی ہوئی ندی کی جھاگ پانو میں کلیلیں کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ صرف سر پر لٹکتی ہوئی لمبی لمبی توریوں اور بیئے کے گھونسلوں کو پیچھے ہٹانا ہوتا تھا۔

چھجے پر سے مجھے وہ خار دار تار صاف دکھائی دیتی تھی جس کے باہر باادب با تمیز لڑکے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ سرمئی کانٹوں سے بھرپور تار سبز رنگ کے ستونوں سے لپٹتی ہوئی پرتھوی بل کے بڑے پھاٹک تک پہنچتی تھی اور اس پر ننھی ننھی کالی کالی چھانپلیں اپنا وزن درست کرتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔ وہ سبز سے ستون دور سے نہایت خوشنما وردی پہنے ہوئے سپاہی نظر آتے تھے اور وہ تار ہماری اخلاقی قرنطین تھی۔ ہمارے بزرگ نہیں جانتے تھے کہ وہ تار ہماری قرنطین نہیں ہوسکتی تھی۔ انسان بغیر تار کے، بغیر کسی حد کے مقید اور محفوظ رہ سکتا ہے.... ضرورت ہے آزادی کی....

میرے دیکھتے دیکھتے میرے تمام ہجولی آئے اور کپڑے اتار کر پانی میں داخل ہو گئے.... ننگے دھڑنگے.... کیسی آزادی تھی جس میں سوچنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ تھوڑا سا خیال، معمولی سی سوچ بھی ایک تباہ کن تہذیب بن سکتی تھی — بالمکند نے لکڑی کے ایک بڑے سے لٹھے کو پانی میں دھکیل دیا اور خود اس پر منہ کے بل لیٹ گیا۔ اس کے ہاتھ اور پانو چپّو کا کام کرنے لگے۔ میرا تصور چمک اُٹھا۔ کنارے پر شانتی اور سوماں مٹی اور دھول میں کھیل رہی تھیں۔ انھیں

مٹی کے ساتھ کھیلنے سے منع کیا جاتا تھا لیکن وہ مٹی کے ساتھ اپنے رشتے کو سمجھتی تھیں۔ اس رشتے کو جو ماں باپ بھائی بہن کے رشتے سے زیادہ گہرا تھا... کہیں زیادہ گہرا اور ابدی....

اسی دن میں نے بابا کو سب کا بلا اجازت ندی میں نہانے اور دھول سے کھیلنے کا واقعہ کہہ سنایا۔ لڑکیاں اور لڑکے بھر پٹ گئے۔

انسان کی فطرت کتنی آزادی کی طالب ہے۔ ملکی آزادی، جسمانی اور شخصی آزادی، روحانی آزادی.... اس کا اندازہ کوئی با اخلاق غلام نہیں لگا سکتا۔ انسان تو چاہتا ہے کہ اسے روٹی کپڑے کی لعنت سے بھی آزاد کر دیا جائے۔ پرتھوی بل نے مجھے ذہین اور با اخلاق بنا دیا۔ میرے بزرگ بہت ہی خوش تھے کہ میں دوسرے بچوں کی طرح گستاخ نہیں تھا لیکن... مجھے معدے کی شکایت رہتی تھی۔ جو بچے جانوروں کی طرح چرتے رہتے، تندرست رہتے لیکن میں جو کھانے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہمیشہ بیمار رہتا۔ ڈاکٹر کہتا تھا بندی کو اینیمیا ہے۔

دیوان خانے میں صندل کی صندوقچی کے پاس ایک قلم دان رکھا تھا اس پر چند پیسے پڑے تھے۔ میں ایک لیمپ جلا کر اس کی مدھم مدھم روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا لیکن میرا دل، میری سامعہ شہتوت اور چنار کے پتوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی سیٹیوں کی طرف متوجہ تھی۔ میرا منہ بڑے بڑے اور لمبے شہتوتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اور میرے ہاتھ پاؤں ایک خواب آلودیائی کے اندر چیونٹوں کی طرح حرکت کر رہے تھے۔ میں نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر ایک زری اور بئے کے گھونسلے کو پرے ہٹا دیا... مجھے محسوس ہوا انسان کا ارض و سما کی وسعتوں سے بھی ایک رشتہ ہے۔

پرتھوی بل کے باہر ہوادتا اچارج بدستور کروندے اور سنگاڑے بیچ رہا تھا۔ میں نے میز کے قریب کھڑے ہو کر نفرت سے اپنے جسم پر لگے ہوئے سُرخ نشان کو دیکھا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے قلم دان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہاں سے پیسے اٹھالیے اور نشان کو پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیا۔

اب میں قرنطین سے باہر تھا۔ وہ سبز خاموش سپاہی مجھے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ میری جرأت کی داد دیتے تھے۔ میرا دل بے پایاں آسمان کی طرح کھل رہا تھا۔

شام کو مجھے بخار ہوگیا۔ میرا دل اور میرا جسم قدرت کی سخاوت کے قابل نہ رہا تھا۔ پھر میرا ضمیر مجھے برابر سرزنش کرتا رہا۔ میری نبض تیز ہوگئی۔ شام کو بابا آئے۔ ان کا چہرہ مجھے ٹیڑھا میڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ پھر رنگا رنگ نقطے بسیط ہونا شروع ہوئے لیکن ان نقطوں اور حلقوں کے درمیاں مجھے بابا کی دودھیا سفید ڈاڑھی بدستور ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ میں نے بابا کو بتایا کہ اماں نے مجھے چوری کے الزام میں بہت پیٹا ہے۔ حالانکہ میں نے چوری نہیں کی۔ معاً مجھے یاد آیا۔ بابا نے بھی اپنی زندگی میں ایک چوری کی تھی ——— لیکن جب انھوں نے چوری کا اقبال دادی اماں کے سامنے کر لیا تھا اور اس دن اماں جان جو پیسوں کے متعلق پوچھتی رہیں تو میں نے صاف لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اس وقت مجھے بار بار یہی خیال آتا ! کاش میں اپنے بابا کی طرح کشادہ دل انسان ہوتا اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیتا۔

اچانک ایک بہت بڑے درد نے میرے جسم اور ذہن کا احاطہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد مجھے یوں معلوم ہوا جیسے کوئی پُرشفقت ہاتھ میرے سر کی تمام گرمی کو کھینچ رہا ہے۔ میں نے ہولے ہولے آنکھیں کھولیں اور بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"بابا، آپ کہانی سُنائیں۔"
"کون سی کہانی ـــــ میرے بیٹے؟"
"جب آپ چھوٹے تھے ـــــ آپ نے ایک بار چوری کی... آپ نے ماں کے سامنے اس بات کو مان لیا ـــــ جب آپ بہت چھوٹے سے تھے نا؟"
بابا میری ماں کو آواز دیتے ہوئے بولے "سیتا! اِدھر لانا ایک پانی کا گلاس... تم نے نندی کو کیوں پیٹا ہے؟ میں جانتا ہوں وہ کیوں بیمار ہے... لاؤ پانی، لاؤ گی بھی؟"
پانی کا گلاس لے کر ایک گھونٹ نیچے اتارتے ہوئے بابا بولے "ہاں نندی! میں نے یہ کہانی تمھیں سنائی تھی۔ میں نے چوری کی تھی۔ اور ماں کے سامنے اس چوری کو مان لیا تھا؟... اس کے بعد بابا نے ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت جب کہ وہی پُرشفقت ہاتھ میری تمام مصیبتوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ان کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اور انھوں نے اپنا مُنہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا" سچ یہ ہے... میں نے چوری کی تھی.... جب میں چھوٹا تھا۔ اور سنو نندی میرے بیٹے ـــــ اُٹھ کر کھیلو ـــــ میں نے آج تک تمھاری دادی کے سامنے اس چوری کا اعتراف نہیں کیا؟

آخری اسٹیشن

جیون ــــ یا بہتر طور پر جیجون دو آبہ اس لائن کا آخری اسٹیشن تھا اور گاڑی اس کی طرف بے تحاشہ بھاگی جا رہی تھی جس طرح بجھنے سے پہلے شعلے میں ایک لپک پیدا ہوتی ہے اسی طرح گاڑی کی رفتار میں بھی ایک لپک سی پیدا ہو رہی تھی۔ دائیں اور بائیں شوالک سے سلسلے دو لمبے لمبے بازوؤں کی صورت کھل رہے تھے، اور اس وسیع و عریض آغوش کے اندر چھوٹے چھوٹے ٹیلے، گینگ ہٹ، آم، جھاڑیاں، جھونپڑیاں، گاڑی کے آخری چھکڑے کو پکڑنے کے لیے پیچھے کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ دور کہیں پٹھو اور مویشی گوپھیے میں پڑے ہوئے کنکروں کی مانند ایک بہت بڑے دائرے میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت بارش تھمی ہوئی تھی لیکن کچنال اور آم کے پیڑوں کی سیاہ چھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ دن اور رات کے چار پہروں میں چھاجوں ہی پانی پڑ گیا ہے۔ سورج برساتی شام کے شوخ و شنگ رنگوں کے درمیان بادل کے ایک ٹکڑے میں الجھا ہوا پریشان نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنی کہر تھی، اور سیل جسے اس نے اٹھانا تھا، پانی زمین پر کہیں کم تھا

اور کہیں زیادہ۔ ہوا ساکن تھی اور گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان زمین کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہے۔

کبھی آنِ واحد میں یوں محسوس ہونے لگتا جیسے باہر دکھائی دینے والا ہر ایک نظارہ ہمارے ہی کسی اندرونی منظر کا عکس کثیف ہے ——

جے رام اُداس تھا اور اسے فضا میں مغمومیت دکھائی دیتی تھی۔ وہ گاڑی میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بے کلی سے جیجون دوآبہ ٹرمینس کا انتظار کر رہا تھا کبھی وہ درد سے اپنی سیٹ پر اچھل جاتا اور کبھی سامنے چوٹیوں پر دھندلی سی دکھائی دینے والی برف کو دیکھ کر اس کی انگلیاں اس کے سفید بالوں میں دھنس جاتیں اور وہ سوچتا —— جس طرح گاڑی ایک لیک کے ساتھ اپنے مقام آخر کی طرف بھاگی جا رہی ہے، شاید میں بھی اپنے مقامِ آخر کی طرف لپکا جا رہا ہوں۔ یکایک اس نے مقابل کی نشست پر پڑی ہوئی مائی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"بھولی مائی! اُٹھ دیکھ! تیرا جیجون آ رہا ہے"

مائی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا جلال جو ایک چالیس سالہ رنڈاپے اور لاولدی کا شاخسانہ تھا اور جو کسی ناخوش گوار خواب کی وجہ سے مدھم ہو گیا تھا، عود کر آیا اور وہ ایک بچی کی طرح خوش ہو کر بولی "آگیا جیجون —— بس یہاں سے سات کوس پرے رہیں میری بیٹی اور جنوائی —— میری سیتا رام کی جوڑی!"

باہر سے ایک ننھی سی کنکری اُڑی اور جے رام کی آنکھ میں پڑ گئی کچھ دیر کے لیے اس کی آنکھیں اندر کی طرف سمٹ گئیں۔ پتلیاں قدرے پھیلیں اور حقیقت حال کی خلش کے باوجود اسے گزرے وقت کے ڈراؤنے خواب دکھائی

دینے لگے۔ زرد رو۔ جفاکش، شکست آشنا جے رام نے اپنے ماضی میں جھانکا تو اسے اپنے بے کیف پچاس برسوں میں ایک حیات افروز لمحہ نظر آیا۔ اس وقت جب کہ جے رام زندگی کی بیسویں خزاں دیکھ رہا تھا، کرتاپور اسٹیشن کے پیاڈ پر ایک لڑکی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور کئی دن جے رام کی عقل و حیا محبت کے گو پھیے میں پڑی رہی۔

ایک دھکا سا لگا اور قریب کے شور و غل سے پتا چلا کہ گاڑی جیجوں دوآبہ ٹرمینس کے احاطے میں داخل ہو کر کھڑی ہو گئی ہے۔ بھولی مائی اور اس کے ساتھ دوسرے مسافر اترے اور باہر نکلنے کے لیے پھاٹک کی طرف بڑھے ——— اس وقت شام لمحوں کی سولی پر تڑپ رہی تھی اور سیاہی کی لمبی لمبی لٹیں اونچے اونچے کھمبوں، پُل اور شیڈ کی مدد سے دن کے شانوں پر بکھر رہی تھیں۔ جے رام بھی غم اور کپڑوں کی گٹھڑیاں اُٹھائے پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن رک گیا۔ اس وقت ٹھٹھر گانو جانے کا اسے سمبندھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

معاً جے رام کو ایک یسا خیال آیا جو اس نے سفر سے پہلے سوچا ہی نہ تھا ——— اسے اب ٹھٹھر گانو میں پہچانے گا کون؟ وہ کھوٹن کے ایک پُرانے خاندان سے تعلق رکھتا تھا لیکن کھٹ کچھ تو جیجوں اور کچھ ہوشیارپور اور اس کے نواح میں آباد ہو گئے تھے اور اپنے بیڑوں کی وجہ سے جیجوں میں ایک خاص شہرت کے مالک تھے۔ ٹھٹھر میں صرف ایک تایا بابو کی خبر ملتی تھی لیکن وہ تو جے رام کے بچپن ہی میں ضعیفی اور جھکی ہوئی کمر سے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے قبر تلاش کر رہے ہوں۔ اس وقت ان کا موجود ہونا ایک ناممکن سی بات تھی۔ ان کی چار یا پانچ لڑکیاں تھیں جو ایک ساتھ شادی

کے بعد سنتو کھ گڑھ، اونہ، گڑھ شنکر اور اس کے نواح میں اس طرح بکھر گئی تھیں جیسے آتشیں انار کی چنگاریاں چھوٹتے ہی چاروں طرف بکھر جاتی ہیں اور جے رام پلیٹ فارم پر پڑے ہوئے بنچ کی طرف لوٹا اور مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جیجون دوآبہ ایک خاصا بڑا اسٹیشن تھا۔ کبھی جیجون ایک بڑی منڈی ہوا کرتی تھی جس کے لیے اسٹیشن پر ایک یارڈ تعمیر کیا گیا تھا جو ان دنوں سونا پڑا تھا۔ لائن پر بچھانے کے لیے پتھر تو ابھی تک بھیجے جا رہے تھے سائیڈنگ میں بڑا سا کرین یک و تنہا بیکار و بے مصرف کھڑا دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مرغ ہے جسے بھوننے کے لیے اس کے بال و پر نوچ لیے گئے ہوں اس کرین سے پیچھے ہٹ کر دو مال گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے چھتوں کے نہ ہونے سے ان میں پتھر اور بارش کا پانی پڑا تھا۔ سائیڈنگ کے شمال کی طرف ریل پر چند ٹھوکریں تھیں۔ ایک ٹھوکر باقیوں کی بہ نسبت کافی فاصلہ پر تھی اور یہ دور صرف اس لیے بنائی گئی تھی کہ انجن کو شنٹ کرنے میں آسانی رہے۔ یا اگر گاڑی تیزی و تندی میں آگے نکل جائے تو اسے پٹری پر سے اُترنے یا ٹکرانے کا خطرہ نہ رہے۔ اور لوہے کی یہ بڑی بڑی اور مضبوط ٹھوکریں جے رام کو ہراساں کرنے لگیں۔ جے رام نے سوچا کاش یہ ریلیں ایک دم ان ٹھوکروں پر رُک جانے کی بجائے سامنے دکھائی دینے والی پہاڑی میں گم ہو جائیں۔

جے رام نے اٹھ کر اپنے جسم کو ایک بوسیدہ اور پیوند لگے کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور ایک نہایت مشتبہ انداز میں اسٹیشن کے جنگلے کے ساتھ ساتھ گھومنے لگا۔ جنگلے کے قریب اندھے کنوئیں پر پیپل کا ایک تنا

بڑھا ہوا تھا اور ایک لنگور اپنی لمبی سی دُم کو تنے پر بل دے کر کنوئیں میں اوندھا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے کالے کلوٹے چہرے میں دو بھوری سی آنکھیں راکھ میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ گھاٹیوں کے نیچے پانی بڑے زور شور سے بہہ رہا تھا اور اس برساتی نالے کے شور میں جیجون کے قصبے کا سب شور ڈوب رہا تھا۔ اسٹیشن کی فضا خاموش اور افسردہ تھی، جدھر سے جے رام آیا تھا اُدھر لائنوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ ایک بڑے جنکشن اسٹیشن پر ہی کم از کم اتنی لائنیں تھیں جتنی جے رام کے جسم میں شریانیں اور وریدیں اور وہاں سینکڑوں ہی خلاصی، قلی اور یارڈ مین تھے، جو آتی جاتی گاڑیوں کے درمیان بے کھٹکے مطلب بے مطلب گھوما کرتے۔ کبھی کبھار کوئی انجن آناً فاناً دندناتا ہوا شیڈ کے دوزخ سے سرمہ اڑاتا ہوا کسی کو جھپٹ میں لے لیتا، لیکن صبح سے پہلے کوئی اور مائی کا لال اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے آدھمکتا۔ اور جے رام نے سوچا یہاں جیجون کی کسی سونی لائن پر کوئی بے کھٹکے سر رکھے اور سو رہے۔

جب سے جے رام آیا تھا کسی نے ٹکٹ بھی تو نہیں پوچھا۔ ایک صاحب جو انداز سے اسٹیشن ماسٹر اور کپڑوں سے حجام معلوم ہوتے تھے، کرتا اور تہمد پہنے ہاتھ میں ناریل سنبھالے، کھڑاؤں سے کھٹ کھٹ کرتے ایک ٹوٹے ہوئے لیمپ کے ستون کے قریب کھڑے ہو کر کانٹے والوں کو بے تحاشہ صلواتیں سنا رہے تھے۔ کانٹے بدستور گالیوں سے بے اعتنا دُور کھڑے سبز اور سُرخ بتّیوں کی پریڈ کر رہے تھے۔ اسٹیشن کے اسٹاف نے یہاں وردی پہننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ کہیں برس میں ایک آدھ بار ٹریفک انسپکٹر آنکلتا تو اس کا حصّہ چپکے سے ہاتھ میں تھما دیا جاتا اور پھر اسے دھوتی

کرتے میں ہی سورج دکھائی دینے لگتی۔ بہت ہوتا تو وہ بڑے مشفقانہ انداز میں اسٹیشن ماسٹر سے کہہ دیتا ——

"مرجاؤ گے مادھولال —— مرجاؤ گے سردی میں تم لوگ!"

انسپکٹر پیسوں کی حدّت اور اسٹیشن ماسٹر جیحون کی سردی سے کسی قدر آشنا ہو گیا تھا "مرجاؤ گے تم لوگ" کا جواب ایک مختصر 'ہونہہ' کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ جے رام گھوم پھر کر پھر اندھے کنوئیں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اس کی تہہ میں لوٹے ہوئے ڈھکنے، قمچیاں، پیپل کے پتّے، پتھر اور پانی کو دیکھنے لگا۔ لنگور اس وقت تک کہیں بھاگ گیا تھا۔ اس کی جگہ چند چھوٹے چھوٹے بندر قلابازیاں لگانے لگے۔ ایک ننھا سا بندر اپنی ماں کے پیٹ کے ساتھ چمٹا ہوا نیچے گویا موت کو دیکھ کر منہ چڑا رہا تھا۔ جے رام نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر زندگی کی اس لغو نقل کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ لیکن وہ اس کارِ خیر کے لیے بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ جیسے اوپر بندر کا بچہ موت کا منہ چڑا رہا تھا، اسی طرح موت جے رام کا منہ چڑا رہی تھی۔

دُور گھاٹیوں پر چند روشنیاں ایک سمت کو جاتی ہوئی دکھائی دیں جے رام اس تیس برس کے عرصہ میں بہت کچھ بھول چکا تھا۔ لیکن اسے یہ نظارہ کچھ مانوس سا معلوم ہوا۔ جنگلے سے پرے ہٹتے ہوئے وہ اسٹیشن ماسٹر کے قریب پہنچتے ہوئے بولا:

"یہ روشنیاں کیسی ہیں بابو؟"

اسٹیشن ماسٹر نے مونچھوں کا ایک بڑا سا فلٹر اٹھایا اور ایک بھدّی سی آواز میں بولا "یہ لوگ گانو جا رہے ہیں۔"

"کون گانو میں؟"

"یہی ٹھٹھر ——— سنتو کھ گڑھ بگیرہ"

جے رام خاموش ہو گیا۔ اس خیال سے اُسے ایک گونہ تسلّی ہوئی کہ جیون دوآبے سے پرے بھی ہزاروں پگڈنڈیاں شوالک کے گرد بل کھاتی چلی جاتی ہیں جس طرح تنا سنخ کے پہلے طالب علم کو موت کے دروازے میں سے جھانکنے پر اپنی ہی سیکڑوں شبیہیں دکھائی دی تھیں، اور حیات ومات اسے صرف ایک کھیل سا نظر آیا تھا۔ اس طرح ان پگڈنڈیوں کو دیکھ کر جسم وروح میں لرزہ پیدا کر دینے والی ریلوں کی ٹھوکریں جے رام کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ جیجون دوآبہ ایک برانچ لائن کا ٹرمینس ہو تو ہو، لیکن انسانی قدموں سے بنی ہوئی پگڈنڈیوں کا اختتام نہیں۔

اسٹیشن ماسٹر نے پھر مونچھیں اٹھائیں اور بولا:

"تم کون ہو؟"

جے رام نے ایک سرد آہ بھری اور بولا:

"میں کون ہوں؟ ——— میں ایک مسافر ہوں بابا۔"

مسافر کا لفظ ہم شکست پسندوں کی لغت میں ایک خاص معنی رکھتا ہے ایک خاص انداز میں، مسافر، کہنے سے دو سننے والے ایک ہی دُنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ٹکٹ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی، اور اس بے حد جذباتی اور روایات کا منظر لیے ہوئے لفظ سے گفتگو اور ہی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر جس کے پردادا کو لقوہ کی شکایت تھی، کچھ تتلایا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ران پر مارا۔ اور پھر ایک لمبی سرد آہ بھرنے کے بعد انجن کی طرح بھاپ چھوڑتے ہوئے بولا۔

"ہو بابا ——— ہر شے مسافر ہر چیز راہی!"

اور پھر ٹرمینس اسٹیشن والوں کے لیے مسافر کا لفظ ایک خاص وسعت اور حدود رکھتا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے ایک فرسودہ سا مصرعہ دُہرایا۔

"اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے۔"

اور یہ مصرعہ اسٹیشن ماسٹر نے کسی شاعر کے دیوان کی بجائے لاری کے ایک تختے پر خدا کے ہندو، سکھ اور مسلم ناموں کے درمیان مقیّد اور محفوظ پڑھا تھا اور شرابی ڈرائیور کی ہر ممکن غلطی اور خطرے کا جواز تھا۔ یکایک اسٹیشن ماسٹر کو پتا چلا کہ اس مصرعے کے پڑھنے سے وہ یکلخت اپنی جیورس ڈکشن سے پرے ذلیل لاریوں اور پرندوں کی دنیا میں چلا گیا ہے۔ اس نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے سورداس کی ایک چوپائی پڑھی اور بولا:

"ہو بابا ـــــ یہ دنیا مسافر خانہ ہے ـــــ ہر ایک کو آنا جانا ہے۔
یہ سنسار ستھیا مایا ہے ـــــ کوئی اپنا ہے نہ پرایا ہے ـــــ"

اس بات کے بعد جے رام نے اپنے آپ کو اسٹیشن ماسٹر کے بہت قریب محسوس کیا اور وہ اس کے پاس لاٹھی ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس زمین میں کچھ دیر طبع آزمائی کرنے کے بعد رسمیات میں داخلہ ہوا۔ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا:

"آپ کا دولت خانہ کہاں ہے؟"

جیرام نے مسکراتے ہوئے اپنی کرم خوردہ بتیسی دکھائی اور اپنے مذہبی اور ملّی انکسار سے بولے "میرا غریب خانہ کھٹھر ہے ـــــ اور آپ کا؟"

"میں ہمیرپور یا ٹھاکر ہوں ـــــ"

'بندہ' کی جگہ 'میں' کا لفظ آجانے سے جے رام کو اچنبھا ہوا۔ لیکن اسٹیشن ماسٹر سچا تھا۔ ٹھاکر بندے نہیں ہوتے۔ یہ تو بہت کیا کہ وہ 'میں' ہو گئے، ورنہ

'ہم' سے ورے کوئی صیغہ استعمال نہیں کرتے۔ جے رام کچھ جھینپ گیا یکایک اُسے خیال آیا کہ ٹھاکر ٹھٹھر گاؤں کے داماد بھی ہیں اور اگر مصلحت اپنے بے ہنگم پن کی بنا پر گدھے کے سے ناقابلِ قبول جانور کو اپنا باپ بنا لیتی ہے، تو ایک نوع سے اسٹیشن ماسٹر کو اپنا داماد متصور کر لینے سے کون سا گناہ ہوتا ہے۔ جے رام نے باچھیں کھلاتے ہوئے خوشامدانہ لہجہ میں کہا——

"ہو ٹھاکرے!——ٹھاکروں کے ہاں ہمارے ٹھٹھر کی بھی ایک لڑکی ہے"

"ہاں ہاں" اسٹیشن ماسٹر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا "میرے بڑے بھائی کی بیوی ٹھٹھرائی ہے"

جے رام لاٹھی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کمبل میں اپنے بازو پھیلا دیے اور یوں دکھائی دینے لگا، جیسے کوئی گدھ پرواز کرنے لگا ہو۔ آنکھوں کو سکیڑ کر اس نے ایک مرتبہ پھر اسٹیشن ماسٹر کی طرف غور سے دیکھا اور بولا:

"تم کیدارے کے چھوٹے بھائی ہو؟ بجّو باورے...... ہے ہے بجّو باورے......" اور جے رام پھر ہنسنے لگا۔

اسٹیشن ماسٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کوئی آناً فاناً ننگا ہو جانے پر اِدھر اُدھر دیکھا کرتا ہے۔ ایک مسافر قریب ہی کھڑا اس عجیب و غریب نام کو سن کر مسکرا رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے راز داری میں جے رام کو آنکھ ماری اور سر کو ایک جھٹکا دیا۔ گویا کہہ رہا ہو "ہوں تو بجّو باورا لیکن یار چُپ رہو۔ یہاں ذرا عزّت بنی ہوئی ہے اور مادھو لال کے نام کے سوا مجھے اور کوئی کسی نام سے نہیں جانتا"

جے رام نے دونوں ہاتھوں میں اسٹیشن ماسٹر کا ہاتھ بھینچ لیا اور بازو گویا کلول کے لیے اس کے گلے میں ڈال دیے اور نسبتاً اونچی آواز میں بولا "چھوڑ دو یارو۔ لوگوں کے لیے تم ہوگے مادھو وادھو۔ پر جے رام کھٹ کے لیے تم بجو

باورے ہو۔ اُف! ـــــ اُف! کتنی دیر کے بعد تمھیں پایا ہے اور یہ نام ہم نے بھارت ورش کے پرسِدھ گویّے کے نام پر تمھیں دیا تھا۔ یاد ہے تم نے ٹیکر چنت پور کی پر ایک بہت ہی بھدّی آواز میں مالکونس کی دھن الاپی تھی، تب سے . . ہو ہو . . . "

اسٹیشن ماسٹر کو سب کچھ یاد تھا لیکن وہ اسے بھولنا ہی قرینِ مصلحت سمجھتا تھا۔ اس وقت بندر نے ایک زقند لگائی اور مادھولال کے کندھے پر آ بیٹھا۔ مادھولال نے متوجہ ہوئے بغیر ایک خفیف سی بھوں چڑھائی اور اسے ایک طرف ہٹا دیا۔

جے رام بولا "بجو باورے! تمھارے ہاں کتنے بندر ہیں؟"

"کبھی بہت تھے۔ اب تو روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔" مادھولال نے جواب دیا اور ایک معلوماتی بات سُنانے کا فخر حاصل کرتے ہوئے بولا "یہ بندر بہت مفید جانور ہے۔ سنتے ہیں کوئی ڈاکٹر وارنوف ہے جس کے تجربوں کے لیے یہاں کے بندر پکڑ کر لے جائے جا رہے ہیں۔"

"ڈاکٹر وارنوف؟"

"ہاں۔"

"کوئی روسی ڈاکٹر ہے؟"

"ہاں ـــــ"

"کیا کرتا ہے وہ بندروں کا؟"

شُترکینہ صفت مادھولال نے اسی دم بجو باورے کا بدلہ چکاتے ہوئے کہا "جب کوئی شخص تم سا بوڑھا ہو جاتا ہے اور کسی قابل نہیں رہتا، تو اس میں بندروں کے غدود شامل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ نئے سرے سے جوان بن جاتا ہے۔"

شاید جے رام کے ذہن میں شہر کا کوئی اشتہاری مضمون چکر لگانے لگا۔ "یہ سائنس بھی کیا واہی تباہی ہے" جے رام نے کہا اور مسکرا دیا۔ مرد اپنی قوت کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کرتا اس لیے جے رام نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ان سفید بالوں سے بڈھا نہ سمجھ لینا بجّو باورے"

اور دونوں دیر تک ہنستے رہے جے رام بولا "ان غدودوں سے بندر کی سی پھرتی بھی پیدا ہو جاتی ہو گی؟"

"یہ تو نہیں کہہ سکتے" مادھولال بولا "لیکن بھائی یہ تجربہ خوب ہے۔ ڈاکٹر وارنوف کا۔ اور اسے اپنے تجربہ کے لیے بندر بھی ہردوار چنت پورنی وغیرہ سے ہی ملتے ہیں۔ یہ لوگ آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھتے ورنہ انھیں ہندستان کا رخ نہ کرنا پڑتا اب چند برسوں سے یہ بندر پکڑے جا رہے ہیں۔ وقت آئے گا یہاں ایک بھی نہ ہو گا اور سچ پوچھیے تو مہابیر کی مورتیاں اب بھی کم دکھائی دیتی ہیں۔ اسٹیشن کے چار بابوؤں، پانچ خلاصیوں، جیجون کے پجاریوں اور مہابیر دل والوں نے ایک میموریل وائسرائے کو بذریعہ تار بھیجا ہے ——— لیکن دوست! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔ شکل بہت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ——— کہیں خفیہ پولیس مین تو نہیں؟"

"ہو ہو ہو . . .!"

جے رام نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"میں الو کھٹ کا بیٹا ہوں۔ منجھلا بیٹا ——— پہچانا؟ ——— جس کا بڑا اور چھوٹا بھائی دونوں لاہور کے پاگل خانے میں ہیں"

اس معمولی سے اشارے سے مادھولال کو سب کچھ یاد آ گیا۔ ہماری دُنیا ہوشیاروں کی نسبت پاگلوں کو زیادہ یاد رکھتی ہے۔ اور زندہ لوگوں کی

نسبت مرے ہوئے لوگوں کے گناہ فوراً بخش دیتی ہے۔ مادھولال بولا۔

"میں آنو کھٹ کے سب بیٹوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں ——— بچپن میں ہم نے ایسی شرارتیں کی ہیں جن کی یاد آتی ہے تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے۔ لیکن وہ بچپنا تھا نہ آخر ——— کہو، تم اتنے دنوں رہے کدھر؟"

اس وقت اندھیرا پوری طرح اپنا تسلّط جما چکا تھا۔ آسمان پر ستارے اور شیڈ میں چمگاڈر ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہوئے تھک چکے تھے۔ اور املی کے درختوں میں اپنے گھروندے یا لوہے کے کسی گارڈر کے ایک کنارے لٹک گئے تھے۔ ٹھٹھر جانے والی روشنیاں ایک کہکشاں سا بن گئی تھیں جے رام نے حکیمانہ انداز میں اپنی ٹھوڑی تھامتے ہوئے کہا۔

"میری کیا پوچھتے ہو بابا! بہت سے کھیل کھیلے ہیں، بہت چوٹیں کھائی ہیں، اب آخر میں ایک بڑے وکیل کا منشی تھا۔ اس سے پہلے عدالت میں ریڈر تھا۔ یہ قانون تو میری انگلیوں کی پوروں میں ہے۔"

"یہ بات ہے۔" مادھولال نے مصافحہ کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "میرا ایک عزیز تین سو دو میں دھر لیا گیا ہے ——— آنوُ ——— کیا نام ہے تمہارا؟"

"جے رام!"

"جے رام! ——— اچھا تم اپنی کہہ لو۔ پھر میں اس مقدمہ کی کہوں گا۔"

"نہیں نہیں ——— تم کہو۔" جے رام نے مادھو کو تھپکتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی بولنے لگا۔ "کسی کے سامنے اپنی مونچھ نیچی نہیں ہونے دی۔ یہ اپنا دھرم نہیں ——— اور نہیں تو آج ایک پورے ضلع کا مجسٹریٹ ہوتا۔"

مادھولال نے پلٹ کر اپنے سامنے بظاہر ایک رذیل آدمی کو دیکھا۔ جو اپنی لاٹھی سے زمین پر حلقے بنا رہا تھا اور تیکھی اور مسلسل نظر سے اسے گھور رہا

تھا۔ اس نظر کی تاب نہ لاتے ہوئے مادھولال نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس بظاہر رذیل آدمی کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ قائل ہوتے ہی بنتی تھی۔ جے رام نے ایک سرد آہ بھری اور ناک کے رقیق لعاب کو کمبل کے ایک کونے سے پونچھتے ہوئے کہنے لگا ——

"لادی کا بیل جب بھاگے گا، گھوم پھر کر لادی کے پاس آکھڑا ہوگا۔ بڑے منصف سے لڑائی ہوئی تو ریڈری چھوڑ کر وکیل کا منشی ہوگیا۔ یہ میرا آخری پیشہ ہے۔ اس سے پہلے میں بیس پیشے اختیار کر چکا ہوں۔"

مادھولال نے بات کاٹتے ہوئے کہا "تمھیں بھوک تو لگی ہوگی جیرام؟"

جیرام نے پیٹ پر ہاتھ مارا اور بولا "ہاں، ہے تو —— بھوک سے ناف کے نیچے ایک کھلبلی مچی ہوئی ہے اور یوں ڈکار آرہے ہیں، جیسے برسوں کے لیے کھالیا ہے۔"

"اچھا تو چلتے ہیں —— چلو ——" اور مادھولال نے اپنے پوربی خلاصی کو آواز دیتے ہوئے کہا "اے سکھوئی۔ بندریا کے نندوئی۔"

ایک کالا سیاہ آدمی جس کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن تھیں قریب آنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اندھے کنوئیں پر وہی لٹک رہا تھا۔ اور یوں بھی لنگور بندریا کا نندوئی ہوتا ہے۔ سکھوئی لیمپ روم سے ہاتھ میں مٹی کے تیل اور راکھ سے آلود ایک چیتھڑا لیے ہوئے آکھڑا ہوا اور بولا:

"کیا ہے سرکار؟"

"دیکھو، لالہ کی گٹھڑیاں اٹھالو۔ پھینک دو اس چیتھڑے کو؟"

سکھوئی نے ایک گٹھڑی اٹھائی۔ غم کی گٹھڑی۔ مادھولال نے کم از کم وقتی طور پر اٹھا لی تھی اور جے رام کچھ سبک سا محسوس کرتا ہوا ساتھ ہولیا

راستے میں بہت دیر خموشی رہی۔ کبھی کبھی اندھیرے میں پتھروں سے ٹھوکر کھانے پر "اوہ" کی آواز پیدا ہوتی۔ آخر جیرام بولا ـــــ

"دراصل میں دُنیا سے بہت اُچاٹ ہوں باورے! بہت اُچاٹ ہوں۔ اس لیے میں اِدھر بھاگ آیا ہوں۔ میں نے بہت دولت برباد کی ہے۔ لیکن کچھ بن نہیں سکا ہے۔ میری طبیعت میں چند ایسے مستقل نقص پیدا ہو گئے ہیں جنھیں میں کوشش کے باوجود ٹھیک نہیں کر سکا۔"

مادھورام سنتا گیا۔ جے رام بولتا گیا۔ ایک مقدس گرنتھ میں لکھا ہے ـــــ "کتنے ہی جوبن ہیں جو محبت کے بغیر مرجھا گئے ہیں" اور دراصل میری عادتوں، میری سب بے اعتدالیوں، میرے نشے، میرے تلوّن سب کا کارن یہی ہے کہ میرے ساتھ کسی نے محبّت نہیں کی۔ میں نہیں جانتا آج تک نہیں جانتا محبّت کسے کہتے ہیں۔ کرتارپور میں تیس سال پہلے ایک واقعہ پیش آیا تھا ـــــ ایک نوجوان لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ لیکن چھوڑو اس بات کو باورے۔ اب تک تو وہ آٹھ دس بچوں کی ماں ہو چکی ہوگی۔ اور کیا معلوم وہ اب کرتارپور میں ہو بھی یا نہیں۔"

اس دوران لامحدود فضا میں چند خاکے پیدا ہونے شروع ہوئے اور سکھوئی خود بخود ایک جگہ پر جا کر رُک گیا۔ یہ کمرہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک خوبصورت کوارٹر کا ذیلی حصّہ، اس کا ضمیمۂ محض تھا جس کا ایک دروازہ غائب تھا۔ دوسرا دروازہ کھلنے پر میل اور مٹی کا تعفّن باہر کی طرف لپکا۔ اس کمرے کے اندر ایک اور دروازہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کی درز میں سے روشنی کی ایک گھٹی ہوئی کرن کمرے کے خاکی ذرّات کو تیرتے ہوئے دکھا رہی تھی۔ دوسری طرف سے باورے کی نوجوان لڑکیوں کی غٹرغوں بھی سُنائی دے

رہی تھی۔ کمرے کے ایک طرف پیال بچھی ہوئی تھی۔ یہاں مادھولال اپنی گائے باندھا کرتا تھا جو ان دنوں بیانے کے لیے باہر بھیج دی گئی تھی۔ سکھوئی نے اشارہ پاکر جیرام کا بستر پیال پر پٹک دیا اور جے رام بستر کھولنے لگا۔

جے رام کے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی۔ کاش! اُسے بھی گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا اور ادھر کسی نرم و گرم کونے میں جگہ دی جاتی۔ لیکن مہمان نوازی بھی مرتبے کے تلوے چاٹتی ہے۔ اور وہ خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد کھانا اور کھاٹ آگئی۔ جے رام کو اپنی حالت پر رحم آنے لگا۔ اس کے تخیّل میں رفعت تھی۔ جس نے پیال کی دنیا کا خلا پاٹ دیا تھا۔ باورے نے بھی کھانا کھایا اور ڈکار لیتے ہوئے بولا "بس دال پھلکا ہی ہے" جس کا مطلب تھا کہ اس کے اہتمام کا بار بار تذکرہ کیا جائے اور مزید برآں شکریہ بھی ادا ہو۔ لیکن تحسین و شکریہ میں جے رام نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ باورا اور بھی زیادہ منکرانہ لہجہ میں بولا ——— "بس تمھارے پانو کی خیریت پرماتما نے سبھی کچھ دیا ہے۔ دودھ ہے، پوت ہے، بھاگوان بیوی ہے..."

جے رام کو یہ بات خوش نہیں کر سکتی تھی۔ اسے زندگی میں یہ سب نعمتیں یا تو میسر ہی نہیں آئی تھیں، اور جو میسر آئیں وہ وفا نہ کر سکیں، وہ دوسروں کی خوشی میں خوش نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اس نے ڈبیہ نکال کر کچھ پھانکا اور اپنی بے چینی کے نکاس کے لیے بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولا:

"کچھ روزگار کی کہو باورے ———"

شاید اگر مادھولال مقروض ہوتا تو اس کے دل کو ایک نوع کی خوشی ہوتی، لیکن مادھولال بولا "میں یہاں 'سی' کلاس کا اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ چند

مہینوں میں 'بی' کلاس کا ہو جاؤں گا اور ایک بڑا جنکشن اسٹیشن ملے گا۔ یہاں قریب ہی ایک اسٹیشن کے لیے کوشش کر رہا ہوں جہاں سے سارے پنجاب میں سلیپر جاتے ہیں اور مونگ پھلی۔ فی سلیپر چار آنے اور فی بوری مونگ پھلی دو آنے ملتے ہیں۔"

جے رام نے گھبرا کر بات کاٹ دی۔" ابھی تمھاری نوکری کافی ہو گی۔"

مادھولال بولا۔" ابھی بہت کافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ریٹائر ہونے سے پہلے میں 'اے' کلاس کے اسٹیشن پر قائم مقام اسٹیشن ماسٹر تو ہو سکوں گا۔"

اس کے بعد مادھولال اٹھ کر چلا گیا۔ جے رام کی بھی یہی خواہش تھی۔ وہ پہلے ہی اپنا منہ چھپانے کے لیے بستر ٹٹول رہا تھا۔ سونے کی کوشش کے باوجود جیرام کو نیند نہ آئی۔ اُسے مادھولال سے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی دنیا اس بیل کی مانند دکھائی دینے لگی جو بڑے سے درخت پر چڑھتی ہے، بڑھتی ہے لیکن پُر وایا، پچھوایا کے پہلے ہی جھونکے پر سڑ جاتی ہے۔

گیلی پیال کی سڑاند سے جے رام بہت بیزار ہوا۔ صبح سویرے کچھ آنکھ لگی، تو مرغیوں کی غٹرغوں نے اسے جگا دیا جے رام اٹھا اور اس نے دروازے کے قریب ہو کر باہر جھانکا۔ دور کرین پتھروں کا دانہ دنکا چگ رہا تھا اور اس کے ارد گرد مزدوریوں چمٹے ہوئے تھے جیسے پُر مغز ہڈی کے ارد گرد چیونٹیاں چمٹ جاتی ہیں۔ کچھ بندر گھنے پیپل سے مسافر خانے کی چھت پر اُتر آئے اور اسے وارنوف کی تجربہ گاہ بنا دیا تھا۔ نیچے مسافر اسٹیشن کے اندر داخل ہونے کے لیے ایک دوسرے میں اُلجھ رہے تھے، حالانکہ کوئی خاص بھیڑ نہ تھی۔ لیکن یہ افراتفری مسافروں کی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی۔ باہر نکلتے تھے تو افراتفری دکھاتے تھے اور اندر آتے تو سراسیمگی کا اظہار کرتے —— مادھولال

کے سامنے ہی کسی نے ایک گنوار کو دھکّے دے کر چند لاتیں اور گھونسے رسید کیے۔ لیکن وہ شخص پھر سے صافہ باندھ آنکھیں جھپکاتا ہوا اسی جگہ آ کھڑا ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں . . . "

جے رام کے دل میں پھر باورے کی مطمئن دُنیا اور اس کا شاندار مستقبل پیدا ہو گیا۔ ایک دم حبس سا محسوس کرتے ہوئے جے رام اُٹھا اور اپنے کپڑے لتّے سمیت باہر نکل آیا۔ اس جلدی میں اس نے اپنے میزبان کا شکریہ تک ادا نہ کیا۔

باہر نکل کر وہ چند غلیظ اور تندرست پٹھوؤں کے پاس پہنچا اور بولا ـــــــ "کیوں بھائی ٹھٹھر چلو گے ؟"

پانچ چھ پٹھو جے رام کے بوجھ کے لیے دوڑے اور پھر ایک ساتھ اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے آپس میں لڑنے لگے لیکن اور ایک آدمی ٹھٹھر جانے کے لیے دکھائی دیا تو سب کے سب جے رام کا بوجھ رکھ کر اس کی طرف بھاگے اور پھر وہاں بھی وہی ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ جے رام پٹھوؤں کی اس حرکت سے اندازہ نہ کر سکا کہ کیوں اس کی گٹھڑی پہلے تھامی اور پھر ایکا ایکی پھینک دی گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی وجہ کا پتا چلا۔ پٹھو اکیلے ہی دو مسافروں کا بوجھ اُٹھانا چاہتے تھے۔ ایک جسمانی طاقت کے لحاظ سے سب پر حاوی تھا۔ دوسرے مسافر کی گٹھڑی لے کر جب وہ جے رام کے بوجھ کے لیے لپکا تو جیرام نے للکارا "خبردار! اگر اسے کسی اَنے ہاتھ لگایا تو"

سب کے سب اس پیر فرتوت کی شکل دیکھنے لگے جو کہ اب گٹھڑی پر دھرنا مارے مُنہ میں فحش گالیاں ہنمنا رہا تھا۔ دوسرا مسافر جانتا تھا کہ جب تک پٹھو دوسرے کے بوجھ سے لد نہیں جائے گا یہاں سے نہیں ہلے گا۔ اس

نے جیرام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"لالہ! دے دو بوجھا اپنا ـــــ دیتے کیوں نہیں، آؤ چلیں"

جیرام نے قہر آلود نگاہیں اس نئے مسافر کی طرف اٹھائیں۔ اور پھر یہ جان کر کہ یہ میرے ہی گانو کا آدمی ہے، چُپ ہو گیا ورنہ جھپٹ ہو جاتی۔ نئے مسافر کا جگر خراب تھا۔ آنکھوں کے نیچے بڑے بڑے تھیلے تھے اور آنکھوں کے اندر ککروں کی سُرخی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ککروں کی خارش سے تسکین پانے کے لیے بار بار اپنے بے حد غلیظ کوٹ کے کفوں کو باری باری آنکھوں پر رگڑتا۔ کچھ لب بسور کر اور آنکھیں پھیلا کر وہ پھر بولا ـــــ "تھوک دو غصہ"

جے رام نے کہا "لالہ اگر انسان ہو تو ان بندروں کو سبق سکھانے کے لیے بوجھ یہاں رکھ دو۔ پھر اکٹھے جائیں گے"

لالہ نے مان لیا اور دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ جے رام بولا "ٹھٹھر میں تمہارا کون ہوتا ہے؟"

"میں بیس سال سے ٹھٹھر میں رہتا ہوں۔ اگرچہ میرے جیون میں تین مکان ہیں جن کا تیرہ روپیہ ہر ماہ کرایہ آتا ہے۔ پھر بھی میں ٹھٹھر میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ وہاں کا پانی آنکھوں کے لیے اچھا ہے"

"کیا کام کرتے ہو؟"

"اماوٹ بیچتا ہوں۔ جب آموں کی فصل ہوتی ہے تو سیکڑوں من آم ایک بڑے احاطے میں صفوں پر بچھا دیے جاتے ہیں۔ پٹھو پانو دھو کر اُن میں گھومتے ہیں اور اپنے پانو سے ان کا ملیدہ بنا دیتے ہیں اور پھر اس ملیدہ کو صاف کر کے اور سکھا کر اماوٹ بنایا جاتا ہے"

جے رام نے دور انجن کو پانی پی کر ٹھوکر کے قریب پہنچتے ہوئے دیکھا۔ اُسے

خیال گزرا کہ انجن ٹھوکر سے ٹکرا گیا تو خود اُلٹ جائے گا، اور نہیں تو ٹھوکر کو پاش پاش کر دے گا۔ جے رام کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رک گیا اور وہ اپنی گٹھڑی پر سے اٹھ کر لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوگیا اور انجن کی طرف دیکھنے لگا۔ ٹھوکر کے قریب انجن کے کھڑے ہو جانے سے جے رام نے اطمینان کا سانس لیا اور واپس اپنے بوجھ پر بیٹھتے ہوئے بولا "اماوٹ کا بیوپار کرنے والے تمھارے سب لوگوں کو جانتا ہوں "

" کیسے جانتے ہو؟ لالہ نے پھر کفوں سے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا:

" میں ٹھٹھری کا باسی ہوں۔ آلو کھٹ کا بیٹا۔ چھوٹا اور بڑا بھائی پاگل خانے میں ہیں!

لالہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آلو کے بیٹے سے پُرجوش مصافحہ کیا۔ وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ لالہ اپنا سر بھی ہلاتا رہا گویا اُسے کسی ذہنی الجھن کا حل مل رہا ہو۔ جیرام نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "لیکن لالہ! تمھارے خاندان کے سب لوگوں میں اماوٹ کی تُرشی ہوتی ہے۔" اور تم میں ترشی نام کو نہیں؟

لالہ ہنس دیا۔ جیرام نے جیب میں سے ایک تھیلی برآمد کی اور اس میں سے تمباکو نکال کر ہتھیلی پر ملا اور پھانک گیا۔ اس وقت آسمان صاف تھا۔ اور سورج نکل آیا تھا۔ جس کے نمودار ہوتے ہی دُھند اُترنے لگی اور اس کی وجہ سے سورج اپنی آب وتاب کھوکر ایک کانسی کا تھال دکھائی دینے لگا۔ لالہ کی رعشہ دار آنکھوں کے لیے یہ روشنی بھی زیادہ تھی۔ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا اور جے رام کے کریدنے پر بولا ——

" گھی اور اماوٹ کے سب بیوپاری گندے رہتے ہیں۔ ان کے اردگرد

مکھیاں بھنبھناتی رہتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن اس اماوٹ کی بدولت میں نے تین چار مکان بنا لیے ہیں اور یہاں سے کئی من اماوٹ ہر سال شہر لاہور کو لے جاتا ہوں۔ کل ہی واپس آکر تین بیسی کم دو ہزار کی وصولی کرنے جا رہا ہوں؟

جے رام نے یک لخت لالہ کی باتوں میں دلچسپی ختم کر دی اور اٹھ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بولا۔ "لاہور ہے ــــ لاہور بہت بڑا شہر ہے ــــ وہاں سب کچھ بک جاتا ہے۔ غلاظت، اماوٹ سبھی کچھ بک جاتا ہے"

پٹھو کچھ دور کھڑے بے صبری سے اُن دونوں کی باتیں سُن رہے تھے کچھ مایوس ہو کر چلے گئے اور کچھ اپنے ٹوکروں کے سہارے کھڑے رہے۔ دُور سے ایک اور سواری دکھائی دی اور سب کے سب اس کی طرف دوڑے جے رام نے پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

"چہ چہ ــــ لالہ تم بہت امیر ہو گئے ہو۔ لیکن اس امارت کا فائدہ ہی کیا ہے ــــ تمہاری اپنی پوشش ــــ یہ دیکھو، کمائی تو بازاری عورتوں کی بھی بہت ہوتی ہے، لیکن پیشے پیشے میں فرق ہے نا؟"

لالہ نے آنکھوں پر روک بناتے ہوئے اس بات کی تصدیق کی، کہ یہ آلو کھٹ کا بیٹا بول رہا ہے اور پھر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

"تم چاہتے ہو، تمھیں ساری بھی ملے اور چپڑی ہوئی بھی ــــ یہ دو باتیں ناممکن ہیں"

اس اثنا میں ایک پٹھو تیسرے گاہک سے بھی مایوس ہو کر لوٹا لالہ نے جلدی سے اسے اپنا بوجھا اٹھوا دیا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا۔ پیچھے کی طرف گھوما اور ایک پورا پنجہ اور ایک انگلی دکھاتے ہوئے بولا "اس فصل میں چھ سو من اماوٹ شہر لے جاؤں گا اور ہو سکا، تو ایک ہزار ــــ" اور ایک ہزار کہتے

ہوئے اس نے اپنے دونوں پنجے پوری طرح پھیلا دیے اور اپنا بوجھ آپ ہی اٹھائے گھاٹی کی طرف بڑھا۔ جیرام اس کے غائب ہونے تک اس کے میزان سے بازو، کبھی ایک طرف سے نیچے اور کبھی دوسری طرف سے اوپر ہوتے ہوئے دیکھتا اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا۔ حتیٰ کہ لالہ ایک چٹان کے پیچھے غائب ہوگیا۔

اس وقت انجن واپس لائنوں کے ایک جال میں الجھنے کے لیے جیحون دوآبہ ٹرمینس چھوڑنے کے لیے تیار تھا۔ وہ ادھر رُخ کیے ہوئے تھا۔ جدھر سیکڑوں جنکشن اسٹیشن اور سی کلاس کے اسٹیشن ماسٹر تھے، اور ہر سال ہزاروں من اماوٹ کی کھپت تھی۔ انجن ایک خوش بلّی کی طرح خُرخُر کر رہا تھا اس کی آواز کبھی اونچی اور کبھی مدھم ہو جاتی۔ کبھی ایک اونچی سیٹی بازار میں کھیلنے والے بچوں کو ڈرا دیتی، یا خلاصیوں سگنل مینوں کے نڈر بچے انجن کی نقل میں سیٹیاں بجانے لگتے اور ایک دوسرے کی قمیص پکڑ کر ایک ہاتھ سے پسٹن بناتے ہوئے چلنے لگتے۔

جے رام نے اس پریشانی کے عالم میں گٹھڑی اٹھائی اور مسافر خانے کی طرف چل دیا۔ دنیا کتنی وسیع اور لامتناہی تھی لیکن اس پر اس کا ظرف کس قدر تنگ ہوگیا تھا۔ مسافر خانے میں بھیڑ صاف ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک خوش پوش سامنے آیا اور بولا:

"میں ٹکٹ لینا چاہتا ہوں بڈھے! کیا میرے اس اٹیچی اور بستر کا خیال رکھوگے؟"

جے رام نے اس خوبصورت چھوکرے کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اثبات میں اپنا سر ہلائے، نوجوان اپنا سامان رکھ کر جا چکا تھا جے رام ایک مطیع خادم کی طرح ان چیزوں کے پاس کھڑا ہوگیا۔ وہ نوجوان کچھ دیر کے

بعد ٹکٹ لے کر لوٹا اور جے رام نے پوچھا۔
"صاحب بہادر! کدھر جا رہے ہیں آپ؟"
نوجوان نے یہ خطاب پسند کیا۔ اس نے خوش ہو کر ایک سگریٹ سلگایا ایک ادا سے دیا سلائی کو بجھا کر پانوؤں تلے مسلتے ہوئے وہ قریب قریب سارے کا سارا گھوم گیا اور بولا:
"میں بہت دور جا رہا ہوں، بڈھے بہت دور ——"
"دور ——؟"
"ہاں دور —— تمہارے قیاس سے پرے ——"
"کیا سان فرانسسکو جا رہے ہو آخر؟"
نوجوان نے حیران ہو کر جے رام کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں بڈھے کے جغرافیائی علم سے مرعوب ہوتے ہوئے بولا "بمبئی جا رہا ہوں بابا۔"
"بمبئی ——؟ —— ہے تو دور ہی۔" جے رام سوچتے ہوئے بولا "سیر کرنے کا ارادہ ہے؟"
"میں ایک فلم کمپنی میں ایکٹر بھرتی کر لیا گیا ہوں بابا —— ابھی مجھے ولین کا پارٹ ملا ہے۔ ولین سمجھتے ہونا؟ وہ چھوکرا جو عاشق اور معشوق کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور جس کی لاتوں اور گھونسوں سے مرمت ہوتی ہے۔ لیکن مجھے ان لاتوں اور گھونسوں کی کوئی پرواہ نہیں —— ولین کے بعد اگلا قدم ہے، ہیرو —— میں کچھ بنوں گا، بابا تمہاری دُعا چاہیے۔"
جے رام نے دعا کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی نگاہوں سے وحشت سی ٹپکنے لگی۔ اس نے جنگلہ پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کانپ رہا تھا۔ نوجوان نے اپنا اٹیچی، ٹرنک اور بستر ایک پٹھو سے اُٹھوایا، اور پھاٹک کے

پیچھے غائب ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد پُل پر اس کی ٹانگیں چلتی ہوئی دکھائی دیں
جے رام چند لمحے گو مگو کے عالم میں کھڑا رہا۔ اچانک ایک خیال کے آنے سے
اس کے منہ پر رونق آگئی ـــــ اس وقت گاڑی چھوٹنے کی گھنٹی بجی
جے رام بھاگا اور ٹکٹ گھر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بہت سے پیسے نکال کر
کھڑکی میں بکھیر دیئے ٹکٹ بابو بولا ـــــ

"کدھر جاؤ گے بڈھے؟"

"کرتار پور ـــــ کرتار پور ـــــ" جے رام نے دُہرایا اور گاڑی
چھوٹنے سے چند ہی لمحہ پہلے جے رام گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اس وقت
جب کہ ٹھوکریں یکہ و تنہا کرین، "بجو" باورا اس کی نظروں سے غائب ہوا
اُسے زندگی کافی دلچسپ دکھائی دینے لگی تھی۔

کشمکش

بڈھا موہنا مر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کونوں تک مفت کی بن مانگی ہلدی بکھر گئی تھی۔ چھت، الگنی، سنڈاس، بچوں اور سایوں کی طرف دیکھنے کی بے بضاعت، بے سود کوششوں سے ظاہر تھا کہ اس ساون سوکھے نہ اساڑھ ہرے جسم میں زندگی کی حرص و ہوا ابھی تک باقی ہے۔ بڈھے کی نگاہ واپسیں سے عزیزوں کو ہمدردی نہیں تھی، نفرت تھی۔ آخر جو آدمی ہفتے بھر سے روز جیتا روز مرتا ہو، خدا جانے اس کی کون سی نگاہ نگہِ واپسیں ہوتی ہے۔

باہر اسلحہ خانے کے برابر ایک تنہا ٹرام، شرابی کی طرح لڑکھڑاتی کھڑکھڑاتی شور مچاتی گزر رہی تھی، یا قریب ایک رکشا قلی زور زور سے اپنے گھنگھرو رکشا کے بموں پر مار رہا تھا۔ اسے اپنے سیب کا موتی اگلنے کی جلدی تھی۔ اور وہ یوں تیزی سے بھیڑ کو چیرتا ہوا جا رہا تھا جیسے تیز قصابی چھری کراچی کی مچھلی کے گداز جسم میں سے گزر جائے "باچو، باچو، ہے یوسے۔۔۔" ایک ہجوم ہنستا، کھیلتا روتا، گھر، تھیٹر اور جہنم کی طرف جا رہا تھا۔ اور موہنا کا بتیس سالہ بیٹا راجا اپنے دونوں بیٹوں اور آدھی بیٹی یعنی لنگڑی چھوکری کو بچانے کے لیے ایک پھٹے ہوئے ڈھول کی آواز میں چیختا۔ حتیٰ کہ اس کی رفیقۂ حیات جو بچے پیدا کرنے اور پھر

انھیں فحش گالیاں دینے کی حد تک ہی راجا کی رفیقہ تھی، اپنی رفاقت کا پورا حق نبھاتی ــــ "او توں مار دو، ہیضے کے توڑو اُٹھ جاؤ دنیا سے، ارے سارے جمانے کے گلٹی نکل ری، اور ان کے گلٹی بھی تو نا نکلتی..." گویا بچّے ٹرام کے نیچے آکر تو نہ مریں، طاعون اور ہیضہ انھیں بھلے ہی لے جائیں۔

راجا نے ایک طویل سی جمائی لی اور آخ ــــ کی ایک آواز کے ساتھ اپنے اٹھے ہوئے بازوؤں کو نیچے گرا دیا۔ دو چھوٹے بھائی، ایک بہنوئی اور ایک مسلمان پڑوسی پچھلی رات سے جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں۔ پٹوال سے بڑے دکھائی دیتے تھے اور پانی بے تحاشہ بہہ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں کی دُکھتی رگوں پر کوٹا ہوا پھونکا جلا جست باندھ دیا گیا ہو۔ ان لوگوں میں سے جب کوئی تھوڑی دیر کے لیے اونگھ لیتا، تو یوں محسوس کرتا جیسے جست کے باوجود اس کی آنکھوں پر بالائی باندھ دی گئی ہے۔ سب کی خواہش تھی کہ موہنا ایک طرف ہو۔ اب جب کہ وہ بالٹیوں کا تلہ بھی نہیں لگاتا، کچھ اس لیے کہ بول و براز بھی چارپائی پر ہوتا اور کچھ اس لیے کہ چارپائی پر مرنا بیٹوں کے لیے بھاری ڈنڈ تھا۔ اس ہفتے میں چھ سات بار موہنا کو زمین پر رکھا گیا اور اس کے ہاتھوں پر آٹے کا دِیا رکھ کر اسے سوَرگ کا راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی۔ ابھی کانوں کی لویں سیاہ اور سُرخ تھیں اور روشنی آر پار چلی جاتی تھی، اور ناک کے قریب کانسی کی تھالی کرنے سے کچھ مرطوب سے بخارات جم جاتے۔ موہنا کے دماغ کے کسی کونے میں امید اور لواحقین پر مایوسی سی چھا جاتی۔ زمین کچی تھی۔ اور ٹھنڈی۔ اس پر موہنے کو رکھنے سے یوں ہی جان نکل جاتی۔ موہنے کا مرنا تو سب چاہتے تھے لیکن اذیت دینے سے گھبراتے تھے۔ کچھ گندم اُبال رکھی تھی، کچھ دان

کیا تھا لیکن بے سود۔ ابھی موہنا مرا۔ ابھی جی اٹھا۔

راجا کی جورو نے باہر جھانکا۔ سرطانی سورج صبح سے کھوپڑیاں چٹخا رہا تھا۔ لیکن اب کہیں سے اپنے آپ ہی بادل نمودار ہو گئے۔" اگر بارش ہو گئی تو بڑی مصیبت ہو گی" وہ سوچنے لگی۔ ننھوا، اس کا بیٹا، جسے گلے کی شکایت تھی اور جس کے حلق کا کوّا نیچے گر گیا تھا، چاٹ کھا رہا تھا۔ راجانی نے اسے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ صرف بازار سے رائی لانے کا حکم دے دیا۔ رائی سرہانے رکھنے سے جان جلدی اور آسانی سے نکل جاتی ہے۔ اس وقت ننھوا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

" میں ٹرام کے نیچے آ جاؤں گا ماں!"

اور راجانی خشمگیں ہو کر بولی ——۔

" تو؟ —— تو تو مرتا بھی نا، تجھے توڑے سیتلا —— تیرا مرجا یاوا"

اور پھر اسی سانس میں اسے پچکارتے ہوئے بولی" ارے، لے اُدھنی دیکھ ہماری سرکار نے نئی ادھنی بنائی ہے۔ اب سونے کی ادھنیا بننے لگی ہیں۔ ارے دیکھ۔ ٹین کی پھانٹ پر پیر نہ رکھ دیجیو۔ پھر جائے گی پاؤں میں تلوار کی ما پھک"

جب راجانی اندر آئی تو ایک دفعہ پھر موہنا کو اتار کر چارپائی سے نیچے رکھ دیا گیا تھا۔ راجا کے پہلو میں بیٹھے ہوئے چھوٹے بھائی نے جلدی سے ایک پھٹے ہوئے تکیے سے روئی نکالی۔ ہاتھ میں مل کر جلدی سے بتی بنائی اور راجانی کے بنائے ہوئے آٹے کے دیے میں رکھ دی۔ راجانی نے جلدی سے گھی ڈالا اور ایک بنا سبتی روشنی کوٹھری کی تاریکی پر غلبہ پانے لگی۔ پھر سے باوا کے ہاتھ پر رکھ دیا گیا۔ مسلمان پڑوسی نے سوچتے ہوئے پاؤں کو ہاتھوں سے چھوا۔

پہلے وہ ٹھنڈے تھے۔ اب یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گرم ہو رہے ہیں۔ اور ٹخنوں پر ایک شریان یک لخت حرکت کرنے لگی ——— "قرآن پاک کی قسم" وہ بولا "موہنا بابا جی وہا ہے۔ میں شرط بدتا ہوں" اور پھر جیب کے پیسے بجاتے ہوئے بولا "بولو کتنے کتنے ———؟"

بیٹے ایک دفعہ پھر ہنس دیے اور پھر ایک پژمردگی سی اُن پر چھا گئی۔

راجانی نے جھاڑو اٹھالی اور سنڈاس اور بھوس کی دیوار کے درمیان کا کچا حصہ صاف کرنے لگی۔ راجا نے حلقے کے تھانے دار کے لیے ٹین کا حمام بنایا تھا۔ ڈھانچہ گول کیا ہوا کونے میں پڑا تھا۔ انگیٹھی کی ٹوپی بھی بن گئی تھی۔ اب سب کچھ تپائی پر رکھنا تھا اور لوہے کی رپٹیں لگانی تھیں۔ تپائی چوکی کے قریب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ ایک پیادہ سپاہی کئی دفعہ ہو گیا تھا لیکن اس نئی مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہوتا تب تو۔ ٹین کی ننھی ننھی کترنیں ہاتھوں سے اُٹھا راجانی سنڈاس کے پاس ڈھیر لگانے لگی۔ کھٹیک منڈی کے نواح سے ایک گھا گھ آیا کرتی تھی اور سب بکھرا ہوا ٹین اور بے کار و مصرف لوہا کسی بیدار ملک کو پہنچانے کے لیے سمیٹ لے جاتی۔

پہلی ٹرام نے مسجد کے قریب اپنے مسافر چھوڑے۔ کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اس سے بھی پرے جانے والے تھے اور کچھ سوار ہونے کو تھے۔ ٹرام چلانے والا ہتھی پر ہاتھ رکھے خلا میں گھور رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بلا ضرورت گھنٹی بجا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس کے بنانے والے نے خوب اس کا مضحکہ اُڑایا ہے۔ بس سارا دن شہر میں چکر لگاتے رہنا۔ اور پھر وہیں۔ کبھی ہوتا ہے کہ کوئی کتا نیچے آ کر مر جاتا ہے اور پھر منتظمان کمیٹی کو "نیگلیجنٹ ڈرائیونگ" کے سلسلے میں بیان دینے پڑتے ہیں۔ اس ہموار ساکن

زندگی سے موت اچھی ہے۔ کلپ کلپ کلپ اور چیکر بے تحاشہ ٹکٹیں مسافروں کے ہاتھ میں ٹھونس دیتا ہے۔ بس اس کا کام ہے ٹکٹیں دینا اور پھر ٹھیک سے دام وصول کرلینا۔ اس کی زندگی کا ارتعاش یہی ہے کہ پانچ سال سے بڑا بچہ بلا ٹکٹ سفر نہ کرے۔

اور اس کی ساری زندگی میں شاذ ہی کوئی حسین واقعہ پیش آیا ہوگا۔ ایک دفعہ بیناری چوک سے ایک کنبے کا کنبہ چڑھا، جس میں ایک نوخیز لڑکی بھی چڑھی۔ ماں باپ اس لڑکی کو بلا ٹکٹ لے جانا چاہتے تھے ۔۔۔ "ارے بھئی۔ یہ تو بچہ ہے" ماں باپ چلائے "دیکھو.... بھلا یہ لڑکی جوان ہے؟... یہ تو ریل میں مفت سفر کرتی ہے" چیکر کہنا چاہتا تھا "کیا یہ جوان نہیں ہے؟... دیکھو...؟" لیکن وہ جھینپ گیا اور پائیدان اور سیٹوں کے درمیان پانو جمائے کھڑا لوگوں کے فیصلے کا انتظار کرتا رہا۔ ماں باپ نے دو پیسے بچانے کے لیے چھوکری کو دو سیٹوں کے وسط میں کھڑا کر دیا اور نمایش شروع کر دی "دیکھو یہ جوان ہے؟.... دیکھو...." ایک نوجوان نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے ساتھی سے کہا "بھئی اس طرح تو پتا نہیں چلتا" اور اس دن چیکر کو زندگی کچھ بامعنی معلوم ہوئی۔ پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آیا۔ اس کلپ کلپ اور چیکنگ کو اس نے زندگی کا ایک حصّہ تو بنا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس سے بے طرح غیر مطمئن تھا۔ شاید ایک اور واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ ایک عورت اپنے خاوند کو چھوڑنے آئی تھی۔ اتنے مسافروں کے سامنے وہ اپنے راجا سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ راجا کسی دوسرے دیش میں جانے کے لیے سٹیشن کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اسباب پہلے پہنچ چکا تھا۔ عورت نے پوچھا "اب کب آؤ گے؟" مرد نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا دی اور کہا "جب بھگوان

لائیں گے۔" اور ٹرام چل دی۔ اس کے آہنی اور چوبی پشتوں پر کسی کے آنسو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ عورت بے بسی کے عالم میں اپنی کھوکھلی بے کار نگاہوں سے سڑک پر بچھی ہوئی لوہے کی چار لکیروں کی لا محدود تنہائی دیکھتی رہی۔

اب رائی بھی سرہانے رکھ دی گئی تھی۔ تین گھنٹے اور بڈھا بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اب کنپٹی کے پاس ابھری رگ پھڑکنے لگی۔ موہنا کے منہ میں پانی کا ایک چمچہ ڈالا گیا۔ گڑ گڑ گڑ کی ایک آواز آئی اور اس کے بعد موہنے نے پانی پی لیا۔ راجا نے اپنا ہاتھ اس کی نبض پر رکھا۔ نبض چل رہی تھی اگرچہ ہولے ہولے۔ اس کے بعد یکلخت جیسے سب کچھ ساکن ہو گیا۔ پیشانی گرم تھی اور پھر وہ بانس کی سی ٹانگیں بھی حرکت میں تھیں۔ راجا نے برافروختہ ہو کر کہا:

"بابا کو رکھ دو چارپائی پر۔"

"کیسے رکھ دیں چارپائی پر۔" راجانی بولی۔

"کیسے رکھ دیں؟" راجا نے کہا "جیسے اسے نیچے رکھ دیا ہے اب یہ نہیں مرے گا ـــــ یہ ساری جندگی نہیں مرے گا۔"

"اور ڈنڈ کون دے گا جو مر گیا چارپائی پر؟"

راجا نے خشمگیں ہو کر چھاتی پر ہاتھ مارا اور بولا "ڈنڈ میں دوں گا۔ درگا مائی کی قسم یہ بڈھا کبھی نہ مرے گا۔"

چھوٹے بھائی چاہتے تھے، کہ بابا ٹھنڈے فرش پر محض ٹھنڈک کی وجہ سے نہ مرے لیکن چارپائی پر مرنے کے ڈنڈے وہ بھی گھبراتے تھے۔ بھائی کے چھاتی ٹھونکنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ راجا کے جسم پر سے ایک پھٹی پرانی

پیوند لگی چادر علاحدہ کرتی ہوئی راجائی بولی۔

"ہم تو کبھی ڈنڈ نہیں دینے کے۔ ہماری جندگی ہی ڈنڈ دینے میں گجر گئی۔ چھوٹوں کو بڑا کیا، بیاہا۔ اب آنکھیں دکھاتے ہیں۔ جو کسی سے پنونده دھاما لیا وہ یہ دینے ہار نہیں۔ اب چارپائی کا ڈنڈ دے، اتنا امیر آیا ہے نا!"

پھر راجائی نے راجا کو چڑاتے ہوئے چھاتی پر ہاتھ مارا ــــــ "جھٹ چھاتی بج اٹھتی ہے۔" مسلمان پڑوسی اشارے سے ان کو بک بک جھک جھک سے منع کرنے کے علاوہ منہ میں کچھ ورد کر رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ( ) کی طبیعت اکتا گئی۔ وہ کوئی فرض پورا کر رہا تھا۔ اسے بار بار اپنی زخمی گھوڑی یاد آجاتی تھی جس کی جان نہیں نکلتی تھی اور اس کی بیوی اور بچے تھان کے قریب کھڑے رو رہے تھے۔ آخر راجائی نے کسی کو بلا کر گیتا کے اٹھارویں ادھیائے کا پاٹھ کروایا اور جوں ہی پاٹھ کرنے والے آخری شبدوں پر پہنچے گھوڑی نے جان دے دی۔ اور اب جب کہ موہنا گھوڑا بلکہ گدھا جس نے ساری زندگی بار برداری اور ٹین کوٹنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا تھا مر رہا تھا، تو مسلمان پڑوسی کو بھی لازم تھا کہ ان کی مدد کرے۔ لیکن اس بار شلوک بھی کارگر نہ ہوئے۔ رائی سرہانے سے لے کر دروازے تک بکھر گئی۔ آخر بہت دیر بعد جب سب نے مل کر موہنا کو چارپائی پر لٹا دینے کا فیصلہ کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تو اس کی پتلیاں پھر گئیں اور وہ فرش اور چارپائی کے درمیان ہی مر گیا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ موہنا کا مقدر تھا کہ وہ زمین پر مرا نہ آسمان پر۔ اس وقت دن تھا نہ رات۔

راجا نے چارپائی کے نیچے گھس کر ایک بڑا سا سرکنڈہ نکالا۔ اس کو چھلکے سے صاف کیا اور لاش کے برابر کا ناپ کر اُسے موہنا کے پاس رکھ دیا تاکہ ماپ رہے اور رات کو مردے کے جسم میں کوئی شیطان روح نہ

داخل ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود بخود جھینپ گیا۔

"کب لائے تھے تم سرکنڈہ راجا بھیا؟" چھوٹے بھائی نے پوچھا۔

"ابھی لایا ہوں" راجا نے صریحًا جھوٹ بولتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے ابھی ننھوا کے ہاتھ منگوایا ہے" سب کھلی مار کر ہنس پڑے۔ یہ سرکنڈہ دو ہفتے سے یہاں پڑا ہوا ہے۔ اتنی دیر سے ان لوگوں کو موہنا بابا کے مرجانے کی توقع اور خواہش تھی اس کے بعد راجا ئی ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ اس کا راجا بھوس کے لیے نمونہ لایا تھا۔ مگر سب بے سود۔ کھلی اور بھی اونچی ہو گئی۔

اگلی صبح محلے والوں کی رائے سے بابا کو بڑا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ آخر پوتوں والا آدمی، زندگی کے سب فرائض سے سبک دوش ہو چکا تھا۔ اس کا جلوس نکالنے، اسے بڑا کرنے سے بیٹوں ہی کی عزت تھی۔ بہوؤں کی مانگ میں سیندور ڈالا گیا حلوان کشمیرے کی چادر، کفن اور جھنڈیوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا۔ چھوٹے بھائی نے راجا اور منجھلے کی نسبت زیادہ روپے دیے اس کے بعد چھوٹ کے لیے جٹ، چھوہارے اور میٹھے چنے وغیرہ منگوائے گئے اور صبح بوان اٹھایا گیا

——آج پھر ٹرام والوں کے لیے ایک حسین واقعہ تھا۔ ایک بوان شمشان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے آگے گھنٹیاں بج رہی تھیں اور پیچھے کپڑے رنگے ہوئے سر منڈائے دو تین آدمی تھے اس کے ساتھ دوسرے مرد اور عورتیں مل کر ایک گانا گا رہی تھیں۔ یہ گھنٹی اور یہ سواریاں اور یہ جنازہ بردار! گویا یہ جلوس بھی ایک سست رفتار ٹرام تھی جو کہ بغیر ریل کے ایک معیّن راستہ پر جا رہی تھی اور سارا دن شہر کا چکّر لگانے کے بعد شمشان کے باہر رُک جاتی تھی۔ کچھ سائیکل والے اتر پڑے۔ ایک صاحب نے اپنا ہیٹ اٹھایا

ایک مسلمان جو بیٹھا تھا کھڑا ہو گیا۔ ٹرام والے نے ایک لمحہ کے لیے بریک لگائے اور خلا کی بجائے سُرخ حلوان اور کشمیری چادریں لپٹے ہوئے جسم کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ اس بوڑھے کے اپنے بچے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

اس وقت بوان کے اوپر سے میٹھے چنوں اور باداموں کی چھوٹ ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی بادام ٹرام میں بھی آ گرتا۔ ایک عورت اپنے بچے کو ٹرام میں بٹھا کر نیچے اتر پڑی اور کچھ میٹھے چنے ہاتھ میں لے آئی اور واپس اپنے بچے کے قریب آتے ہوئے بولی ——"لے بیٹا، لے کھا لے، تیری عمر بھی اتنی لمبی ہو جائے گی۔ اس بڈھے کی عمر سے بھی جیادہ"...

ٹرام کے ڈرائیور، چیکر اور زندگی سے بے حد غیر مطمئن و مایوس ایک بابو نے عورت کی اس حرکت کی طرف دیکھا اور پھر تینوں نے ایک دم اچک کر بوان پر سے گری کے جُٹ اور چھوہارے اتار لیے اور رغبت سے انھیں کھانے لگے۔ اس کے بعد "چل میرے بھائی" کی آواز آئی اور ٹرام لائنوں کے ایک جال میں انجھنے کے لیے چل دی....

گالی

چٹھی رساں کچھ نئے تھے اور کچھ پرانے۔ لیکن ان سب لوگوں کا بلا لحاظ مذہب و ملّت ایک قبیلہ سا بن چکا تھا۔ ان میں رحمت نور اور پرتاپ سنگھ کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔

"ہمہ الف نہیں آیا؟" پرتاپ سنگھ نے دن بھر کے کام کے بعد اپنی "واپسی" میز پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

خواجہ ــــــ کلرک نے نفی میں سر ہلا دیا اور آنکھ کے ایک گوشے سے پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ خواجہ جانتا تھا کہ تریسٹھ الف یعنی رحمت نور اور پرتاپ سنگھ میں جب تک جوتی پیزار نہ ہو لے کسی کو کام کا مزا ہی نہیں آئے گا۔

"کھا جاــــــ" پرتاپ سنگھ نے خواجہ میں رحمت نور کا ایک مہنگا بدل تلاش کرتے ہوئے پکارا۔ خواجہ کو معلوم تھا کہ پرتاپ سنگھ رند نے جان بوجھ کر اس کے نام کو بگاڑا ہے۔ اس نے ایک بڑی ہوشیار نگاہ سے پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھا اور بولا ــــــ

"کیوں بڑی خارش ہو رہی ہے سردار؟"

اچانک پنگ پانگ کی سی بڑی میز کے دوسری طرف رحمت نور اپنی شکاری جالی اور غیر تقسیم شدہ پارسل رکھتا ہوا دکھائی دیا۔ گرمی کی شدّت سے اس کی بُری حالت تھی۔ پسینہ کولھوں کے فراز سے نشیب میں گرتا ہوا خاکی پتلون کے نیچوں بیچ پنڈلیوں پر قطرہ بہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ اس کے جھلی تراش کے بال پگڑی کی لپیٹ میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ پرتاپ سنگھ نے ' کھا جا، سے ٹکر لینی مناسب بھی نہ سمجھی اور فوراً تریسٹھ الف کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا :

" اے رحمت نور ——— دیکھ تیری عقل کے بخیے اُدھڑ رہے ہیں "

رحمت نور نے اپنی ذات اور اپنے ارد گرد سے باخبر ہوتے ہوئے اپنے بال پگڑی میں دبانے شروع کیے۔ بکھرے ہوئے بالوں کے متعلق عقل کے بخیے کا کنایہ غالباً پرتاپ سنگھ نے ——— خدا گنجے کو ناخن نہ دے، اگر دے گا تو عقل کے بخیے اُدھیڑ دے ——— کی ضرب المثل سے لیا تھا۔ اس میں رمز یہ بھی تھی کہ رحمت نور چندیا سے چٹیل تھا اور یہی اس کی دُکھتی رگ تھی۔

پرتاپ سنگھ نے اسی پر اکتفا نہ کرتے ہوئے کہا " اڑھائی بال ہیں سالے کے اور وہ بھی تو سنبھالے نہیں جاتے " اور یہ سب کچھ اس طور پر کہا کہ کوئی سُنے یا نہ سنے لیکن حق حق دار کو پہنچ جائے۔ کھا جا، سُن کر مسکرایا تو پرتاپ سنگھ کو اس مسکراہٹ میں تائید اور شہ دکھائی دی۔ پھر پرتاپ سنگھ اپنے لمبے کیسوں (بالوں) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا :

" دیکھو واہگورو نے اُدھر کتنی عقل دی ہے، مگر کیا مجال کہ بخیہ اُدھڑا ہوا نظر آئے "

خواجہ نے دل ہی دل میں اس خوش مذاقی پر داد دی اور کہا " تم نے اپنی

عقل کے ناخن اُتروا لیے ہیں لیکن تریسٹھ الف نے نہیں۔"

رحمت نور نے میدان ہاتھ سے جاتے دیکھا تو بولا ——

"خواجہ جی —— سُنا ہے اب سکھوں کے بارہ نہیں بجیں گے؟"

ان دنوں حکومت نے جنگی مصلحت کی بنا پر اسٹینڈرڈ ٹائم میں ایک گھنٹے کا اضافہ کیا تھا اور رحمت نور کا اسی بات کی طرف اشارہ تھا۔ پرتاپ سنگھ نے یہ حربہ اپنے اوپر لے کر اس کی وقعت کو کم کر دیا۔ اپنے آپ پر ہنسنا ایک بہت بڑا فن ہے۔ پرتاپ سنگھ بولا ——

"بلکہ ایک دن میں دو دفعہ بجا کریں گے۔ ایک دفعہ جب کہ بارہ بجا کرتے تھے اور دوسری بار جب کہ ایک بجا کریں گے۔"

اب تک سب پرتاپ سنگھ اور رحمت نور کی ان باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے، اُن کو دیکھ کر ہیڈ کلرک کے نائب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ آپ ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو اندر سے شریف ہوں، لیکن یوں بدمعاش نظر آئیں۔ بڑی بڑی سیدھا موچھیں، گھنے ابرو، ناک بھدّی اور پچکی ہوئی آپ نے آتے ہوئے اپنی اہمیت جتائی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر ضبط و احتساب کا سماں پیدا کرتے ہوئے بولے —— "ہیڈ کلرک صاحب بہت خفا ہو رہے ہیں۔ شور نہ مچائیے" —— اور پھر ان کے شور میں شریک ہو گئے خود بھی طبیعت شاہانہ پائی تھی بلکہ اکبرانہ، کیوں کہ اس دن باگھ اور ہوائی میں لڑائی اٹھتی دیکھ کر آپ کے کئی جذبات کو آسودگی ہوتی تھی۔ ہیڈ کلرک صاحب تو اپنی سیٹ سے ہلتے ہی نہیں تھے۔ انھیں ہمیشہ مثال قائم کرنے کی پڑی رہتی تھی تقلید کی عیاشی کا حظ نہیں اُٹھایا تھا۔ نئے نئے ڈویژن سے بدل کر آئے تھے نہایت شریف، دُبلے پتلے، حسنات متبرکہ کے حامل۔ دفتر میں دو منٹ کی بھی

فرصت ہوتی تو آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ کو یاد کرنے لگتے۔ مثنوی مولانا روم اور تذکرۃ الاولیا سے تعلیم شروع ہو کر انہی دو کتابوں پر ختم ہو جاتی تھی خشوع وخضوع کے بڑے قائل تھے۔ ذرا جذبات کو کسی نے چھیڑا تو آنسو ہیں کہ بہے چلے جا رہے ہیں۔ خیر آپ وہیں بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ جب پرتاپ سنگھ نے رحمت نور کا حربہ اپنے اوپر لے لیا تو رحمت نور نے منی آرڈروں کی رسیدیں اکٹھی کیں اور کانوں کو چھوتے ہوئے بولا:

"چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔"

پرتاپ سنگھ تلملایا۔ فارسی اس کے باپ دادا کو نہیں آتی تھی اور رحمت نور منشی آدھی آدھی بات پر گلستاں کے حوالے دے۔ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہے، یہ ظلم ہے، سراسر ظلم ہے۔ پنجابی بولے پنجابی میں جواب لے، ذرا میدان میں آئے۔ پرتاپ سنگھ ہر غیر ملکی زبان کو کالا علم کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ سٹپٹاتے ہوئے بولا "یہ کیا کالا علم ہے کھا جا صاحب؟" اور اب کے خواجہ صاحب کا نام بڑے ادب اور تپاک سے لیا گیا۔ خ علاحدہ اور داؤ معدولہ۔ اور پرتاپ سنگھ بالکل اس طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی مدد کے لیے اپنی وحشت ناک اور پھٹی پھٹی نگاہیں اِدھر اُدھر چاروں طرف ڈالتا ہے۔ خواجہ اور نائب ہیڈ کلرک جسے ڈاکخانہ کی اصطلاح میں تحصیل دار کہتے تھے، بولے ـــــ رحمت نور کہہ رہا ہے ـــــ "اگر کفر کعبہ سے ہی پیدا ہونے لگے، تو مسلمانی کدھر جائے گی ـــــ؟"

پرتاپ سنگھ نے بدلہ چکاتے ہوئے کہا "تو مسلمانی میرے پاس چلی آئے گی، اِدھر واہگورو کا دیا بہت کچھ ہے" ـــــ اس پر سب خاموش ہو گئے۔

رحمت نور اور پرتاپ سنگھ، کرپا اور عنایت مسیح، یہ سب لوگ ہنستے کھیلتے چیختے چلاتے ایک سانس میں دعائے خیر اور دوسرے میں فحش گالی بکتے اپنا اپنا کام کیے جاتے۔ ان کا سینگ فرا، ان کا کورس ایک قومی ترانہ کی طرح پُرجوش اور جمود شکن ہوتا۔ ان کی گالی ہمیشہ مختصر ہوتی لیکن دعاؤں کے دفتروں سے زیادہ بلیغ اور پھر زود اثر ——!

ان چھٹی رسانوں میں سے کچھ شہر کے بسنے والے تھے لیکن اکثر دیہات میں سے آئے تھے۔ سب کے سب سیدھے سادے تھے، اور بڑے احتیاط سے ناتراشیدہ مگر ان کی تہذیب چیونٹی اور شہد کی مکھی سے بھی زیادہ پرانی تھی جس فنی مہارت اور پرکاری سے یہ الفاظ کے گھروندے بناتے، اس کے لیے اب زیادہ تراش خراش کی ضرورت بھی تو نہ رہی تھی۔ یہ بنا جانے بوجھے گالی کے لطیف فن سے واقف تھے اور صدیوں سے اس ادارے کی اہمیت سے آشنا اور اس بڑی سچائی تک پہنچنے کے لیے کہ گالی بعض دفعہ اپنے اظہارِ خیال کا مختصر اور جامع اور واحد طریقہ ہے، سوچنے کے لیے نہ کسی درمیانی عمل کی ضرورت تھی نہ تجزیہ اور جواز کی۔

ڈاک خانہ کی جوت کے یہ دو سو بیل اسی طرح ہنس کھیل کر اپنے دبے ہوئے جذبات کو فحاشی سے آسودہ کر کے جب ایک ساتھ اور ایک سمت زور لگاتے تو ڈاک خانے کا یہ چھکڑا چلتا رہتا لیکن اس واقعہ کے دوسرے روز ان کی گاڑی کی رفتار ناہموار ہو گئی۔

دوسرے دن پھر رحمت نور قدرے دیر سے برانچ میں داخل ہوا لیکن پرتاپ سنگھ کو دیکھ کر اس کی پیشانی کے تمام شکن استوار ہو گئے۔ پرتاپ سنگھ نے بھی رحمت نور کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ رحمت نور نے قمیص کا تکمہ ڈھیلا

کیا اور قمیص کو پنکھا بنا کر ہلاتے ہوئے کہا "اُف! کتنی گرمی ہے! ـــــــ الامان! ـــــــ الحفیظ!" لیکن آج پرتاپ سنگھ کی حالت غیر تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے لو، لگ گئی ہے۔ رحمت نور نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج خالصہ جی کی بکری بیٹھی ہوئی ہے"

پرتاپ سنگھ خاموش رہا۔ رحمت نور بولا "ابے جھگڑ سنگھ!"

پرتاپ سنگھ نے پھر رحمت نور کی طرف دیکھا۔ مسکرایا اور بولا "خالصہ جی کی بکری نہیں بکرا ہوتا ہے" اور پھر وہ بکرے کی طرح ممیایا۔

سب ہنس دیے۔ "گویا لوگوں کی دیوالی ہوتی ہے سردار جی کا دیوالہ" خواجہ نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا "جواب مسکت دیا ہے پرتاپ سنگھ نے مان لیا ہم نے اسے۔ آج حالت غیر ہے لیکن پھر بھی ـــــــ ہاتھی جیتا ایک لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا"

پرتاپ سنگھ نے فخر سے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ خواجہ نے گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر رحمت نور کو جھڑکتے ہوئے بولا "رحمت نور! ابھی واپسی جلدی دو دیکھو سردار سب کچھ لوٹا چکا ہے"

"جھک مارتا ہے سردار" رحمت نور نے کہا۔

خواجہ نے اپنے آپ سردار کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "بہتر منی آرڈروں میں سے صرف تین واپس لایا ہے ـــــــ صرف تین!"

پرتاپ سنگھ نے فاتحانہ انداز سے رحمت نور کی طرف دیکھا اور کہا "رحمت نور اور کام!.... اب بے چاری رنڈیوں کو بھی کاتنا پڑ گیا ہے"

رحمت نور نے خواجہ کی طرف دیکھا، خواجہ مسکرا دیا اور رمز و کنایہ میں گویا اجازت دے دی۔ رحمت نور نے اس سرکاری تائید سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے اپنے تھیلے کو میز سے سرکا دیا۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے اور بائیں ہاتھ سے میز پر طبلے کی تھاپ دیتے ہوئے گانے لگا۔

بھائی جی دی کچھ وچ گوہ وڑ گئی
اک کڈھن لگے دوجی ہور وڑ گئی

سردار جی کے "کچھے" (سکھوں کی ایک شرعی پوشش) میں گوہ داخل ہو گئی ہے۔ ایک گوہ کو نکالنے لگتے ہیں تو دوسری داخل ہو جاتی ہے)

سب کے سب اس زٹل قافیہ پر ہنسنے لگے۔ جنگ کی وجہ سے قیمتوں کی مہنگائی اور مشاہرے کی کمی، سماجی دباؤ کی وجہ سے جذبات کا ضبط، سب کچھ ان ہی کلرکوں اور چھٹی رسالوں کے چہرے پر لکیروں کی صورت میں لکھا اور ہوائیوں کی صورت میں چھایا ہوا تھا لیکن افسوس فحاشی اور دشنام طرازی کی وجہ سے انھیں یہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا اور وہ ہنسی خوشی اپنا کام کیے جاتے بلکہ کام باقاعدگی اور تیزی سے ہوتا تھا۔ اس علیک سلیک کے بعد رحمت لوز پرتاپ سنگھ، ان کے ساتھی اور کلرک سب آسودہ خاطر ہو گئے۔ سارے دن کی مشقت کے بعد گویا تازہ دم ہو گئے۔

رحمت لوز کا علاقہ ـــــ حلقہ جسے دفتری زبان میں تریسٹھ الف کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بہت گندہ علاقہ تھا۔ یہ شہر کی نئی آبادی تھی۔ آج اگر سفید زمین ہوتی تو کل وہاں ایک خاصا محل کھڑا ہوتا ـــــ کہاں کی اینٹ، کہاں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا ـــــ کوئی ملتانی میں "روٹی میکو ڈیجے" کہتا تو کوئی "کڈھائی و بجنی" کوئی پوٹھوہار کی تہذیب کا باشندہ ہوتا تو کوئی کشمیری گکے زئی اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ، نتیجہ موسیقی نہیں، ایک بے ہنگم سا شور، نیم بورژوا سے لوگ جو محض اس بات پر خوش رہتے، کہ انھیں کسی کی پرواہ

نہیں ہے، جو کسی کے مکان سے واقف ہوتے بھی اس کا پتا بتانے میں اپنی سبکی سمجھتے۔ ایسے علاقے میں ڈاک تقسیم کرنا رحمت نور ہی کا کام تھا اور پرتاپ سنگھ کا علاقہ اس سے بھی برا تھا۔ صاف تھا ستھرا تھا لیکن ریلوے کالونی کے ہر باشندے نے ایک کتا رکھا ہوا تھا جو ہر روز بلا ناغہ پرتاپ سنگھ کی گردن دبوچتا۔ دونوں نے اس کا حل نکالا ہوا تھا۔ رحمت نور نے علاقے کی عورتوں میں ہر دل عزیزی حاصل کر لی تھی اور پرتاپ سنگھ کتوں سے بچنے کے لیے ایک آنہ روز کے چھیچھڑے خرید لیتا اور جب کوئی کتا کاٹنے آتا تو پچکار کر چھیچھڑوں کی رشوت دے دیتا۔ اس کے باوجود گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں ان کی جان نکل جاتی۔ کہیں بخشش مل جاتی تو ایک آدھ گلاس سکنجبین کا پیا جاتا۔ نہیں تو ٹھنڈا پانی اور گھر کی رانی ——

دھوپ کی شدّت سے آج پرتاپ سنگھ بہت گھبرایا ہوا تھا اس کی مسلسل خاموشی کے باوجود رحمت نور نے اسے دبوچ رکھا اور پوچھنے لگا "آج دیر سے کیوں آئے ہو پرتاپ سنگھ؟"

"تمھاری ماں کے ساتھ سو رہا تھا" پرتاپ سنگھ نے ایک غصیلے کتّے کی طرح باچھیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ رحمت نور ناراض نہیں خوش ہوا کہ وہ پرتاپ سنگھ کو چڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ اچانک بائیں طرف سے ایک بادل کی گرج سنائی دی۔ یہ بادل نہیں تھا۔ رشید الدین ہیڈ کلرک صاحب تھے۔ لبوں کے کنارے کف کی ایک کافوری تحریر سی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں نے ڈبل کنکھیوں کے پیچھے سے چندھی سی آنکھیں یوں دکھائی دے رہی تھیں جیسے دو چھوٹے چھوٹے پائپوں میں سے چنگاریاں نکل رہی ہوں۔ بولے "یہ دفتر ہے یا فحاشی کا اڈہ؟ میں یہاں کسی کو گالیاں

نہیں بکنے دوں گا۔"

"بات یہ ہے جناب۔" پرتاپ سنگھ نے جواب دعوے کے انداز میں کہا۔ "میں ...... میں۔۔۔"

"میں میں کا بچہ ـــــ خبردار جو آئندہ ایسا ویسا لفظ نکالا تو۔۔۔"

"میری بات ۔۔۔"

"میں کوئی بات وات سننا نہیں چاہتا۔ سمجھے ـــــ میں پوسٹ ماسٹر کے سامنے اس امر کی شکایت کروں گا۔"

سب خاموش ہو گئے۔ رپٹ پوسٹ ماسٹر صاحب کے حضور میں پیش کی گئی۔ پرتاپ سنگھ اور رحمت نور پر چارج شیٹ لگا۔ لیکن معاملہ تنبیہہ سے آگے نہ بڑھا۔ بڑی خیر ہوئی ایک باقاعدہ آفس آرڈر نکالا گیا جس میں اخلاقیات کے متعلق ایک فحش ابتدائیہ تھا اور اس کے بعد ایک غیر مرکب حکم تھا جو کوئی چٹھی رساں منی آرڈروں، چٹھیوں، بیرنگوں، پارسلوں، رجسٹریوں کی واپسی دیتے ہوئے فحش کلامی کرے گا، اسے فوراً معطل کر دیا جائے گا۔ اور ایمرجنسی پر قابو پانے کے لیے ہیڈ کلرک کے اختیارات بھی وسیع کر دیے گئے۔

اب دفتر ایک اچھا خاصا قبرستان بن گیا تھا۔ کان مقابل کی خاموشی کو پاکر سارا دن سائیں سائیں کرتے رہتے اور ہیڈ کلرک رشید الدین آنکھیں بند کر کے روحانی منازل طے کرتا اور اپنے نفس کی بانگ دراسُن کر حظ اٹھاتا۔ اس کی روح کا جو وقار تکلم سے ضائع ہوتا تھا، اب محفوظ تھا۔

رحمت نور ایک روز معمول سے زیادہ دیر میں آیا۔ اس کے چہرے کی لکیریں زیادہ گہری تھیں۔ آتے ہی اس نے اپنی تھیلی نیچے رکھ دی اور پنگ پانگ والی میز کے کنارے بیٹھ گیا اور واپسی کے کاغذات اور چیزیں بکھیر لیں ـــــ

رحمت نور نے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور منت کے لہجہ میں بولا:
"خواجہ جی۔ اللہ رسول کے لیے مجھے تریسٹھ الف سے نکال لیے۔ میں مر جاؤں گا۔"
خواجا نے روکھے پھیکے انداز میں کہا "یہ تم لوگوں کا بہانہ ہے۔ میں تمھاری شکایت کروں گا۔ کیا اس سے پہلے تم نے اس حلقے میں کام نہیں کیا ——؟"
"خواجہ جی" رحمت نے اسی طرح منت سے کہا "اب اس رقبہ میں آبادی دوگنی ہوگئی ہے، شاید یہ آپ نہیں جانتے اور اگر میرے کہنے پر آپ کو یقین نہیں ہے تو ٹاؤن انسپکٹر صاحب کو کہیے کہ وہ چل کر دیکھ لیں ——"
اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ——
"آپ جانتے ہیں اوورسیر بھی اپنے دفتر کے کیس کرنے کے لیے مجھے دے دیتا ہے اور خالد صاحب ٹاؤن انسپکٹر صاحب بھی۔"
اور پھر رحمت نور سفید خاکی دیوار کی طرف دیکھنے لگا جہاں ایک کیلنڈر کے سوا کچھ نہ تھا لیکن رحمت نور کو اس دیوار پر جانے کیا کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر بولا ——
"خواجہ صاحب میری سفارش کیجیے۔ میرے چھوٹے چھوٹے بال بچے ہیں۔"
اور رحمت نور منی آرڈروں کی رسیدیں پکڑ کر پھر دیوار کی طرف دیکھنے لگا
پرتاپ سنگھ آیا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور آتے ہی رحمتِ نور سے کچھ دور ہٹ کر بولا۔

"چودھری صاحب سلام"
چودھری صاحب نے لمبا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔
"وعلیکم السلام۔ کہیے مزاج تو اچھے ہیں؟"
رحمت نور اور پرتاپ سنگھ اس رسمی گفتگو سے اتنے مایوس نہیں ہوئے

جتنے خواجہ صاحب۔ وہ ہکّا بکّا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے انھوں نے پن ہولڈر اپنے دانتوں میں دبایا۔ اور پرتاپ سنگھ کی طرف دیکھے بغیر بولے :

"پرتاپ سنگھ واپسی دے دو۔"

پرتاپ سنگھ نے خواجہ صاحب کی طرف نہ دیکھا اور جلدی جلدی اپنے تھیلے میں سے منی آرڈر نکالنے لگا۔ ہیڈ کلرک صاحب نہ جانے کیوں مراقبے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ بغل میں دے کر کمرے کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے اور منہ میں بڑبڑانے لگے۔

"آج بہت دیر ہو گئی ہے ——— بہت دیر ———"

خواجہ صاحب نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں ——— ہیڈ کلرک صاحب ——— پتا نہیں کیا بات ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دن چھوٹے ہو گئے ہیں۔"

پرتاپ سنگھ نے منی آرڈر میز پر بکھیر دیے۔ خواجہ صاحب نے ایک نظر منی آرڈروں کی طرف دیکھا اور پھر قلم کو منہ میں رکھ لیا ——— رشید الدین صاحب نے رسیدوں کی طرف دیکھا اور بولے ——— "پرتاپ سنگھ اتنی واپسی کیوں لائے ہو؟"

پرتاپ سنگھ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "سرکار، یا بندے دوہری تہری کوشش کے باوجود نہیں ملتے۔ نہ جانے لوگ کدھر چلے گئے ہیں؟"

ہیڈ کلرک نے شیرازی کبوتر کی طرح گردن پھُلاتے ہوئے کہا۔

"ہوں ———"

رشید الدین اپنی میز کی طرف جا رہے تھے لیکن نہ جانے انھیں کیا خیال

آیا۔ یکلخت پلٹ پڑے اور خواجہ صاحب سے خطاب کرتے ہوئے بولے"خواجہ یار! ان کی کوتاہیوں کو ایر رنگ میں لوٹ کر دینا۔" خواجہ اپنی کرسی سے اٹھا اور میاں صاحب تک پہنچتے ہوئے بولا ـــــ "میاں جی جھاڑ جھپٹ سے کام چل جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے دفتری کارروائی کی؟ ریکارڈ خراب ہو جائے گا بے چاروں کا۔"

ہیڈ کلرک نے کڑی نگاہوں سے خواجہ کو دیکھتے ہوئے کہا: "یہ سب شرارت ہو رہی ہے۔"

خواجہ نے کہا۔ "یہ بات غلط ہے میاں جی!"

خواجہ چلا آیا۔ میاں جی چلے گئے لیکن رحمت نور اور پرتاپ سنگھ بیٹھے تھے اور کھوکھلی سی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ رحمت نور کی پگڑی پھر کچھ ڈھیلی ہو رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ باہر نکل آئی تھی۔ پرتاپ سنگھ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "یار دیکھ تیرے بال باہر نکل آئے ہیں۔ انھیں ڈھانپ لے۔ پوسٹ ماسٹر دیکھ لے گا۔"

رحمت نور نے چپکے سے بال پگڑی کے اندر ڈھانپ لیے اور بیزاری سے بولا۔ "نکلنے دو یار ـــــ منزلِ عاشقاں چہ دوزخ چہ بہشت۔"

پرتاپ سنگھ نے ایک لمحہ کے لیے رحمت نور کی طرف دیکھا اور بولا۔ "یار تجھے اتنی فارسی آتی ہے تو تو تھانے میں محرّر کیوں نہ ہوا۔ منشی گیری کے علاوہ اوپر سے کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ پھر کسی کو ٹھڈے مارو گالی دو، کوئی پوچھتا ہی نہیں۔"

رحمت نور نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو شہید شمار کیا اور ایک روکھا پھیکا سا تبسم لبوں پر لاکر بولا ـــــ "ہاں بھئی ـــــ ڈاک خانہ میں

اگر یوں ہی مٹی خراب کرنا تھی۔"

بہت سے چھٹی رساں ابھی اپنے حلقوں سے واپس نہ آئے تھے بابو لوگ منہ اُٹھا اُٹھا کر گھڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی آرڈر کے محکمہ میں کرپا اور خیراتی داخل ہوئے۔ پھر عنایت شیخ آیا لیکن ہیڈ کلرک صاحب نے کچھ نہ کہا۔ ایک دیر سے واپس آتا ہو تو کسی کو کوئی کہے بھی۔ پھر واپسی بھی زیادہ آنے لگی نصف سے کم ہی چیزیں تقسیم ہوتیں۔ زیادہ واپس کردی جاتیں۔ چھٹی رساں بابو سب لوگ مایوس تھے۔

سارے ہفتہ بھر کی ڈیلیوری برانچوں پر واپس پڑی رہی۔ رشید الدین صاحب آنکھیں جھپکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ چھٹی رسانوں کو آناً فاناً محسوس ہونے لگا کہ مہنگائی الاؤنس کم مل رہا ہے۔ ہفتہ کے دن پوسٹ مین یونین کی معرفت شور مچا دیا گیا۔

پیر کے دن چھٹی رساں کا آدھا سیٹ اتوار کی چھٹی مناکر اور تازہ دم ہو کر آیا۔ اسی نصف سیٹ میں رحمت نور اور پرتاپ سنگھ بھی شامل تھے۔ پرتاپ سنگھ نے رحمت نور کی طرف دیکھا اور رحمت نور نے پرتاپ سنگھ کی طرف۔ پرتاپ سنگھ اپنی جالی کو اُٹھا رہا تھا اور رحمت نور ہوا کے پنکھے کا سوئچ گھما رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ پرتاپ سنگھ نے اپنے گرد و پیش کو بھولتے ہوئے کہا "سنا بے سور کے جنے؟"

"ابے جا، ماں کے . . . !"

رشید الدین ایک ستون کے پیچھے کھڑے تھے۔ انھوں نے رحمت اور پرتاپ سنگھ کی علیک سلیک سُنی۔ ڈبل کان کیو کے پیچھے سے ایک دفعہ انھوں نے رحمت اور پرتاپ کو دیکھا اور خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

ایک عورت

ٹاؤن ہال کے سامنے نسیم باغ کے اندر دو تین چیزیں ہی میری توجہ کا مرکز تھیں۔ ایک لمبا سا سنبل کا درخت جو بھیگی ہوئی سبز چھال کا ایک خوبصورت کوٹ پہنے تھا اور جو ہوا میں دور دیہہڑ رام دھن کے قدرتی نشیب سے ایک شرابی کی طرح جھومتا نظر آتا تھا۔ دوسرے کھلنڈرا احمق سا طالب علم، جو اپنی کتابوں کو دور پھینک کر ہمیشہ ایک ہی انگریزی گانا گایا کرتا تھا، جس کا مطلب ہے ——— جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہتی۔ ان دونوں کے علاوہ بیس بائیس برس کی ایک عورت دکھائی دیا کرتی جو اپنے لقوہ زدہ بچہ کے رال سے آلودہ چہرے کو چومتے ہوئے دیوانی ہو جاتی۔ وہ عموماً ایک ہی طرح کی سفید ویل کی سادہ ساڑھی پہنا کرتی۔ اور اس کے تیوروں کے درمیان کہیں لکھا ہوتا ——— پرے ہٹ جاؤ

پہلے پہل جب میں نے اسے دیکھا تو مجھے خیال پیدا ہوا کہ وہ بھوکی ہے لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس نے کچھ مالٹے خریدے اور اپنے بچے کے سامنے بکھیر دیے۔ اگر وہ بھوکی ہوتی تو ضرور ان مالٹوں میں سے ایک آدھ مالٹا کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتی۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ جنسی بھوک

کی شکار ہے لیکن اگر میرا یہ خیال درست ہوتا تو اس کے ماتھے پر وہ تیور نہ ہوتے اور وہ نوّے فی صدی عورتوں کی طرح اپنے لیے بھی کوئی شوخ رنگ منتخب کرتی۔

لقوہ زدہ ہونے کے باعث اس کا بچّہ بدصورت تھا اور اس کا چہرہ ہمیشہ رال سے آلودہ ہوتا تھا۔ اس کی ماں بیسیوں دفعہ رومال سے اس کا منہ اور ٹھوڑی صاف کرتی، لیکن بچہ ایک احتجاج سے اِدھر اُدھر سر ہلانے لگتا اور صاف کیے جانے کے فوراً بعد ہی لعاب کے بلبلے اُڑانے لگتا، جو ہوا سے بکھرتے ہوئے اس کی ماں اور اس کے اپنے چہرے پر آگرتے اور ایک عجیب نفرت انگیز کیفیت پیدا ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ ایک بے معنی احمقانہ ہنسی ہنسنے لگتا اور وہ عورت خوشی سے رونے لگتی۔

بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایک سیاہ موٹر جو ہر روز نسیم باغ کے دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے اور جس کا ڈرائیور بڑی بدتمیزی سے ہارن کو زور زور سے بجاتا ہے، اسی عورت کو لینے آتا ہے۔ اس کار میں سے ایک لمبا چوڑا مرد ایک چوڑی دار پاجامہ جس کا ازار بند ململ کی قمیص کے نیچے سے جھانکا کرتا، پہنے آتا۔ اس کی گرگابی کا پینٹ چمڑا بہت چمکتا تھا۔ اس کا منہ پان کی پیک سے بھرا ہوا ہوتا۔ زیادہ قریب ہونے سے اس کی سُرخ آنکھوں اور اس کے سانس کے تعفّن سے اس کے شرابی ہونے کا پتا چلتا۔ شاید وہی آدمی اس بچّے کے لقوہ زدہ ہونے کا باعث تھا۔ وہ اس عورت کے قریب آکر اُسے بہت گرسنہ نگاہوں سے دیکھا کرتا اور اسے بازو سے پکڑ کر موٹر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا۔ ان حرکتوں سے وہ اس عورت کا خاوند تو دکھائی دیتا تھا مگر اس بچے کا باپ نہیں۔

اپنے خاوند کے بلانے پر بھی وہ عورت اپنے مخصوص دیوانے پن سے اس بچّے کے ساتھ کھیلتی جاتی اور اس کا خاوند بسا اوقات ایک ٹھنٹھ پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلائے اپنی بیوی کی مجنونانہ حرکتوں کو دیکھتا، کچھ عرصہ بعد بیوی ان ہی دور باش نگاہوں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھتی اور بچّے کے چھوٹے موٹے کپڑے، مالٹے، سیلولائڈ کے کھلونے سمیٹنے لگتی۔ اُدھر ہارن کی آواز بلند ہوتی جاتی۔ ادھر عورت اپنے کام میں تیزی سے منہمک ہو جاتی۔

مجھے اس عورت سے ایک قسم کا اُنس ہو گیا تھا۔ ایک قسم کی دلچسپی جس کی بنا پر میں اس کی ہر حرکت میں معانی تلاش کر لیتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ عورت واقعی خوب صورت تھی یا نہیں، لیکن میرے تخیّل نے اسے بے حد حسین بنا لیا تھا۔ اس کا بالوں کو سنوارنے کا انداز مجھے بہت پسند تھا وہ جھٹکے سے اپنے بے ترتیب بالوں کو پیچھے کی طرف پھینک دیتی اور اپنی انگلیاں پھیلا کر شانہ کی طرح ان میں داخل کرتی ہوئی اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف لے جاتی اور میرے لیے یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ اس کی حرکتیں ارادی ہیں یا غیر ارادی۔

مجھے اس کے خاوند کی طرح اس کے بچّے اور اس کے لعاب آلود چہرے سے بے حد نفرت تھی۔ البتہ بچے کی بے چارگی پر رحم بہت آتا جو میرے دل میں محبت کے جذبہ کو اکسا دیتا لیکن اس قسم کی محبّت جس کی تہہ میں ہزاروں نفرتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوں، اس سے تو محبت نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

بہت دنوں تک میں کسی ایسے موقع کا منتظر رہا جب میں اس عورت سے ہم کلام ہو سکوں، جیسا بازاری محبّت میں ہوتا ہے کہ کسی لڑکی کی کوئی چیز گر جاتی ہے اور کوئی لڑکا اُسے اُٹھا کر صاف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"محترمہ ـــــ آپ کا رومال!"

پھر وہ لڑکی مسکرا کر شکریہ ادا کرتی ہے اور بس محبت شروع ہو جاتی ہے۔ میں بہت دنوں تک دیکھتا رہا کہ اس عورت کی کوئی چیز گرے اور میں کہوں۔

محترمہ ـــــ آپ کی . . . . آپ کی . . . آپ کی . . .؟

اور پھر محبت شروع ہو جائے۔ مگر وہ عورت بہت محتاط تھی اور اس نے مجھے کوئی ایسا موقع نہ دیا۔ اکثر وہ مجھے ارد گرد منڈلاتے ہوئے دیکھتی، لیکن میں اس کو متوجہ نہ کر سکا۔

آخر اُسے ایک دن مالٹے خریدنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس وقت بچے کی جرابیں، ربڑ کی گڑیاں اور کھانے کی چند چیزیں جن کے آس پاس کوّے منڈلا رہے تھے، پڑی تھیں۔ اگر وہ بچے اور ان چیزوں کو چھوڑ کر جاتی تو یقیناً کوّے ان چیزوں کو کھا جاتے اور شاید بچے کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو ٹھونگ بھی لیتے۔ بچے میں پہچاننے کی صلاحیت پیدا ہو رہی تھی اور وہ مالٹوں کا سُرخ رنگ پسند کرتا تھا۔ اس عورت نے کئی مرتبہ اٹھنا چاہا لیکن سب باتوں کی وجہ سے وہ اُٹھ نہ سکی۔ میں نے موقع پا کر اسے کچھ کہنا چاہا لیکن چند دنوں سے اسے مخاطب کرنے کے لیے جو الفاظ میں نے حفظ کر رکھے تھے، بھول گئے اور میں فقط یہی کہہ سکا۔

"محترمہ! . . . آپ کیا چاہتی ہیں ـــــ؟"

اور اس عورت کے تیور بدستور قائم رہے، میں جو اسے اپنے خاوند کی آنکھوں میں دکھائی دیتا تھا، اس نے پھر اسی نفرت سے بھری ہوئی آواز میں کہا ـــــ

"جی نہیں، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

ـــــ اور میری محبت مقفل پڑی رہی۔

اس عورت کا خاوند مویشیوں کے اسپتال میں معلم تھا۔ کم از کم اس کی شکل اور باتوں سے تو یہی پتا چلتا تھا۔ ہر وقت حیوانوں کے ساتھ رہنے سے اس میں ایک خاص قسم کی حیوانیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسے اپنے لقوہ زدہ بچے پر کبھی پیار نہیں آتا تھا اور جب اس کی بیوی بچے کو اس کے بازوؤں میں دھکیلنے کی کوشش کرتی تو وہ گھبراتا ہوا پیچھے ہٹ جاتا...... ہے ہے! میرے کپڑے خراب ہو جائیں گے ــــ میرے، میرے ....!"

اور پھر وہ ان ہی گرسنہ نگاہوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا ہوا کہتا۔

"چلو میری جان۔ شو فراب بہت شور مچا رہا ہے۔"

اس عورت کا نام دمّو تھا۔ خاوند اور بیوی کی باہم گفتگو سے مجھے اس کے نام کا پتا چل گیا تھا۔ دمّو کتنا خوبصورت نام ہے۔ آہستہ سے پکارا جائے تو کتنا اچھا لگتا ہے اور جب دمّو ناراض ہو جائے تو یہ نام لے کر اسے پچکارنے میں کتنا لطف ہے.... یا شاید یہ سب کچھ مجھے ہی محسوس ہوتا تھا ــــ

ایک دن اس کا خاوند کہہ رہا تھا ــــ

"ہمارے اسپتال میں یہی ہوتا ہے۔"

"تو ہوا کرے" دمّو نفرت سے بولی "وہ کوئی انسان تھوڑے ہی ہیں ــــ"

"وہ بہتر انسان ہیں ــــ" خاوند نتھنے پھلاتے ہوئے بولا ــــ

"کیا تمہارا خیال ہے کہ ایک گھوڑے کو لنگڑا ہو جانے پر مارنا نہیں چاہیے کیا یہ اچھا ہے کہ اس کا مالک اس سے برابر کام لیتا ہوا اُسے ہر روز چابکوں سے زخمی کرتا رہے؟"

دمّو نے بدستور نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تو کیا اُسے کھُلا نہیں چھوڑ سکتے؟"

دمّو کا خاوند اپنے بیٹے کی طرح احمقانہ ہنسی ہنسنے لگا اور بولا:

"اس طرح کوئی اسے کھانے کے لیے کچھ نہ دے گا اور وہ بھوکوں مرجائے گا۔ اب یہ فیصلہ تمھارے ہاتھ رہا کہ اس کے ایک دفعہ گولی مار کر اذیت دینا بھلا ہے یا اس کا روز روز کا مرنا۔"

دمّو لاجواب ہو گئی۔ اس نے لعاب سے بھرے ہوئے اپنے بچے کی طرف دیکھا اور پھر اسے ایک گہرے مادرانہ جذبہ سے اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا اور بچہ خو خو کرتا ہوا خلا میں ہاتھ پاؤں ہلانے لگا۔ دمّو نے اسے اتنا پیار کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں ان سب باتوں سے ڈاکٹر کے خوفناک ارادوں سے مطلع ہو چکا تھا۔ ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بات کون سی مشکل ہے۔ وہ دو تین دن تک سب کو کہتا پھرے گا ——— بچہ بیمار ہے ——— اور پھر ایک دن چپکے سے اسے سُلا دے گا ——— اس وقت بچہ گھناؤنے انداز میں خو خو کرنے لگے گا اور اپنے ہاتھ پاؤں موت وحیات کی کش مکش میں اِدھر اُدھر ہلائے گا۔ اس کی ماں جہاں کہیں بھی بیٹھی ہو گی اسے اپنے بچے کی تکلیف کا احساس ہو جائے گا۔ وہ یقیناً اپنے وحشی ہوس راں شرابی خاوند کے اس جرم کو برداشت نہ کر سکے گی۔

اگلے دن میں بینک سے واپسی پر حسبِ معمول سنبل کے سائے میں پہنچ گیا۔ وہاں وہی طالب علم اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں دو گیندوں کو بیک وقت اچھال کر پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کی کتابیں ہمیشہ کی طرح

بند، قریب کے درخت کے سائے میں پڑی تھیں۔ دمّو اپنے بچے کو لیے موجود تھی اور اپنے بچّے کے اس کے پیار کی ہر لپیٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ گذشتہ دن کی تمام باتیں اس کے ذہن میں محفوظ ہیں اور وہ محبت کی ہر کروٹ کے ساتھ اپنے بچّے کو زندہ کرلیتی ہے۔

اس وقت وہ بچّہ رینگتا ہوا گاڑی سے کچھ دور سنبل کے نیچے آگیا تھا اور سنبل کے پھیکے بے مزا پھل کو دانتوں سے بھول رہا تھا اور اس کی ماں اسے زندگی میں پہلی دفعہ چند قدم رینگتے ہوئے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ میں اس وقت صنوبر کے سائے سے نکلا اور مارکیٹ سے چند قیمتی سُرخ مالٹے خرید کر نسیم باغ کو لوٹ آیا۔ وہ بچّہ ابھی تک سُرخ پھل کو بھول رہا تھا میں نے مالٹے اس کی طرف بڑھا دیے اور بچہ رینگتا ہوا میری طرف آنے لگا آخر اُس نے ایک مالٹا ہاتھ میں تھام لیا اور میرے ہاتھ سے دوسرا مالٹا لینے کے لیے میری طرف بڑھنے لگا۔ دمّو میری طرف متوجہ ہوئی۔ مجھے اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا پتا چل رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی، شاید اس کا بچّہ جسے کل ہی اس کا وحشی شوہر محض اس بنا پر مار ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ ان کی محبت۔ کے راستے میں خلل انداز تھا، کسی آسمانی برکت کے نزول سے چلنے لگے۔ اس کے چہرے پر امید وبیم کے تاثرات دکھائی دینے لگے

اگلے دن میں نے بازار سے چند ایک رنگ دار غبارے خریدے اور انھیں دھاگے سے باندھ کر بچّے کے پاس رکھ دیا اور جب وہ نزدیک آکر انھیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے دھاگا کھینچنا شروع کر دیا اور غبارے میری طرف سرکنا شروع ہو گئے اور بچہ آہستہ آہستہ رینگتا رینگتا ان غباروں کی طرف بڑھنے لگا۔

دمّو نے قریب آتے ہوئے کہا:۔ ”دھاگے کو ذرا آہستہ آہستہ کھینچیے!“

میں نے دھاگے کو آہستہ کھینچتے ہوئے کہا ——— "نہیں تو... اسے ذرا تیز چلنے کی مشق کرنی چاہیے"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور اپنی پرانی جگہ جہاں کہ وہ ہر روز بیٹھا کرتی تھی، واپس چلی گئی۔ پھر آئی اور پھر چلی گئی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ وہاں بیٹھ نہیں سکتی۔ کچھ دیر بعد بچے کا لعاب آلودہ فراک بدلنے کی غرض سے وہ پھر چلی آئی اور میں نے کہا

"محترمہ! ——— کون جانے اس کا لقوہ بھی اچھا ہو جائے"

دمّو کا چہرہ چمک اُٹھا۔

کئی روز ایسا ہی ہوتا رہا۔ میں ہر روز بینک سے لوٹتے ہوئے اس بچے کے لیے کچھ نہ کچھ لے جاتا۔ آخر ایک دن میں نے بہت دیر تک بچہ کو گود میں اٹھائے رکھا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اس کا لعاب سے بھرا ہوا منہ پونچھا۔ اس کے بعد میں نے بچہ کا منہ چوم لیا۔

دمّو کا چہرہ حیا سے سُرخ ہو گیا۔ تھوڑے سے گومگو کے بعد وہ میرے قریب آ گئی اور مسکرانے لگی۔

اس وقت سنبل کا درخت تیز ہوا کی وجہ سے زور زور سے ہل رہا تھا اور وہ کھلنڈرا طالب علم سرد ہوا کے جھونکوں سے متاثر ہو کر وہی گیت گنگنانے لگا۔

"جب سردی آتی ہے تو بہار دور نہیں رہ جاتی۔"

اس وقت لقوہ زدہ بچہ میری گود سے اُتر کر ہمارے پاؤں میں رینگنے لگا اور ہم دونوں جانتے تھے کہ اس کا لقوہ ٹھیک نہیں ہو سکتا۔

خطِ مستقیم اور قوسین

پے در پے مقابلے کے چھ امتحانوں میں ناکام سعادت ٹیلر ماسٹر کی دُکان پر کھڑا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اچھے کپڑوں کے ذریعے سے کمیشن کے ممبروں پر رعب ڈالنا ضروری ہے اور اسی لیے اس نے اپنا سوٹ باسط کے ہاں سلوایا تھا۔ اس نے دُکان پر کھڑے ہو کر زولوٹائپ میں لکھے ہوئے بورڈ کی طرف دیکھا ــــــ "باسط لندن ڈپلومیڈ کٹر..."؛

دُکان میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دائیں اور بائیں جھانکا۔ اس کے دل کے کسی کونے میں خواہش تھی کہ اس کی جان پہچان والا کوئی شخص اُسے باسط کی دُکان میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لے ــــــ باسط کٹنگ کے لحاظ سے بڑا استاد تھا، کٹنگ کی انگریزی فرم کے علاوہ کوئی اس کا لگا نہ کھاتا تھا اور شہر کے سب درزی اس کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ لیکن اس وقت بازار میں دفتر جانے والوں کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا اور وہ دفتر جانے والے انٹرویو کی حد سے گزر چکے تھے۔ وہ اس وقت باسط یا ماجد کی دکان پر کیوں آتے؟

لیکن اب انٹرویو سعادت کے لیے ایک عام چیز ہو چکے تھے۔ اگرچہ

اچھے سوٹ کا خیال اس بات کو جھٹلاتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک اور صرف ایک بار وہ اچھی فال "پتلون اور گردن پر جم کر آنے والے کوٹ پہن کر کمیشن کے سامنے چلا جائے۔ اس کے بعد چاہے وہ لیا جائے یا نہ لیا جائے اس میں اس کا کوئی قصور نہ ہوگا۔ وہ اپنے سر سے ایک تو بصورتی کے ساتھ ایک الزام ہٹانا چاہتا تھا... دکان پر جاتے ہوئے اس نے باسط کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر تموّل کے آثار نظر آتے تھے۔ سعادت کو دیکھتے ہی باسط ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکا۔

"اوہ —— آیئے —— آ... پ رُک کیوں گئے؟"

"یوں ہی" سعادت نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کہیے میرا کام ہوا یا نہیں؟"

"جی ہاں —— اتنے تنگ وقت کے باوجود..."

"تو لایئے، دیجیے.... مجھے کہیں پہنچنا ہے۔"

ماسٹر باسط نے معذرت کے انداز میں کہا۔ "صرف تین بٹن ٹانکنے باقی ہیں آغا صاحب۔"

"اوہو!" سعادت نے بیزار ہوتے ہوئے کہا "درزیوں کی یہ عادت نہ گئی —— کہ بس صاحب ایک سیکنڈ کا کام ہے، بس آدھے سیکنڈ کا۔ اور وہ سیکنڈ شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہو جاتا ہے۔ درزی خواہ لندن سے کام سیکھ آئے یا ٹورنٹو سے۔ یہ آدھ سیکنڈ..."

باسط نے بات کاٹتے ہوئے کہا "گستاخی معاف آغا صاحب، آپ جانتے ہیں کہ سوٹ کا کپڑا ہمیں وقت پر مل گیا تھا لیکن استر کے بیے اٹیلین آپ دو دن کے بعد دینے آئے تھے اور وہ بھی دو اڑھائی بجے کے قریب۔ بس

یہ سمجھ لیجیے کہ تیسرا دن بھی آپ کے ذمّہ پڑا۔۔۔؛

"اچھا اچھا" سعادت نے خاموش ہوتے ہوئے کہا۔ اب آپ باتوں میں زیادہ وقت نہ لگائیے اور کاریگر کو کہیے کہ وہ بٹن جلد ٹانک دے ـــــ"

باسط نے ایک کی جگہ دو کاریگروں کو سعادت کا سوٹ دے دیا۔ اور کہا "صاحب ناراض نہ ہو جائیں۔ یہ کام پلک جھپکتے میں تیار ہو جائے" اور اس کے بعد ماسٹر باسط نے بڑے احترام سے آغا سعادت کو دُکان کے اندر بٹھا دیا خدا جانے اس جگہ پر بٹھانے کے لیے باسط کی طرف سے اہتمام ہوا تھا یا نہیں لیکن یہ بات درست تھی کہ وہاں سے دُکان کا کونہ کونہ نظر آتا تھا اور تمام وہ تصویریں جن میں اچھے سے اچھے سوٹوں میں ملبوس اکثر نوجوان انگریز کسی خوبصورت بلانڈ یا برونیٹ کے ساتھ ہوا خوری کے لیے جا رہے تھے، نظر آ رہی تھیں۔ سامنے چار خانے کے ہنٹنگ کوٹ میں گھوڑے پر یا پلس فور میں گولف کی چھڑی کو کندھوں سے اوپر اُٹھائے کوئی صاحب دکھائی دیتے تھے۔ ایک بڑی سی تصویر میں کارنروں کی ڈائنا اپنے کتّے کو تھامے کھڑی نظر آتی تھی اور اس کا گون ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ ڈائنا کا جسم لباس میں ہونے کے باوجود لباس سے علاحدہ نظر آتا تھا۔ اس کی پوشاک میں نظاہر درزی کی قدرت سے زیادہ خدا کی قدرت نظر آتی تھی۔ لیکن چونکہ ہر فنکار کا مقصد خالق کی قدرت کو سامنے کرنا اور آپ خالق کے انداز میں چھپ جانا ہے، اس لیے کسی ہوشیار کاریگر نے احتیاط کے ساتھ ایک بے احتیاطی سی پیدا کر دی تھی، ورنہ اگر وہ تصویر صرف خدا کی ہوتی تو باسط ـــــ لندن ڈپلومیڈ کٹر کی دکان کی بجائے شہر کے کسی کلال خانے میں ہوتی۔

اور یہ ڈائنا کی تصویر پر ہی موقوف نہیں تھا، جہاں سعادت بیٹھا تھا

وہاں سے شیشوں کے اندر قدِ آدم مجسمے نظر آتے تھے۔ جو اتنے سُرخ سپید اور چُپ تھے کہ ان سے ڈر لگتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ چُپ تھے، اگرچہ بولتے تھے! تمام کے تمام مختلف شیڈ کی لیڈی ہمبلٹن پہنے اپنے سراپا کو دیکھ رہے تھے اور ان کے قریب ان بے آوازوں کی آواز، ماسٹر باسط فیتے کو بے پروائی سے گلے میں ڈالے، ڈائنا اور لیڈی ہمبلٹین سے بے خبر اپنا حساب کتاب کر رہا تھا

ابھی دن شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ بل بھی وصول ہونے لگے۔ دو تین آدمی تو اس خاموشی کے ساتھ ہاتھ میں پیسے تھما گئے کہ وہاں چور بازار ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہاں ایسا بازار ہونے کی گنجایش نہ تھی، صرف سینے سلانے کا کام تھا۔ شاید اچھی دُکان کی نشانی یہی تھی، کہ اس کے چور بازار ہونے کا پتا چلے۔ سعادت کے دیکھتے دیکھتے ماسٹر باسط نے دو اڑھائی سو روپے اپنے رومال ٹاپ کی میز کے ایک ڈبے میں رکھ دیے اور ٹاپ کو کھینچ کر میز کی سطح کے برابر کر دیا۔ چابی بدستور گچھے میں تالے کے اندر لٹکی رہی ان روپوں میں ساٹھ روپوں کا سعادت خود اضافہ کرنے والا تھا۔

سعادت جھلا گیا۔ آخر اس نے گناہ کیا کیا ہے۔ جو اسے روپے نہیں ملتے وہ انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سوچتے سوچتے وہ صرف یہی سوچ سکا ——— آخر ماسٹر مجھے ممنون کرنے کے لیے میرا سوٹ جلدی نہیں تیار کر سکتا تھا؟ وہ ایک کاریگر کو زیادہ عرصہ بٹھا لیتا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا، کہ اُسے چار چھ آنے اوور ٹائم کے دینے پڑتے لیکن چیز تو مجھے وعدہ پر مل جاتی شاید باسط ——— لندن ڈبلو میڈ ——— ہونے کی وجہ سے کاریگروں کو وقت پر بلاتا اور وقت پر چھٹی دیتا ہے لیکن لندن سے ڈپلوما اس نے کپڑا کاٹنے کا لیا ہے۔ وقت کا ڈپلوما تو اپنا ہی ہے، اور اسے کاریگروں کی نسبت

اپنے گاہکوں کو زیادہ خوش رکھنا چاہیے۔ حالانکہ کام کرنے والوں کے اوقات سرکاری طور پر تصدیق ہونے کے بعد ڈائنا کی تصویر کے نیچے لٹکے ہوئے تھے تاہم اس وقت سعادت شاپ اسسٹنس ایکٹ کی بابت غور کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"پیسے کو میری زندگی میں دخل ہی نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؛ سعادت نے پھر سوچا اور اب وہ باسط کی دُکان سے باہر اس نئی سیاہ سڑک پر دیکھنے لگا جو سیدھی کمیشن کے دفتر تک چلی گئی تھی۔ جیسے کسی نے پیمانہ رکھ کر اس دکان اور دفتر کے درمیان پون ایک میل لمبا سیدھا خط لگا دیا ہو۔ سعادت نے غنودگی کی سی حالت میں پہلے اپنے سوٹ اور پھر سیدھی سڑک کی طرف دیکھا گویا وہ اتنے اچھے کپڑے پہن کر اس سیدھی سڑک پر چلتا ہوا گیارہ بجے کمیشن کے دفتر میں پہنچ جائے گا اور ہر مہینے چپکے سے اڑھائی سو روپے جیب میں ڈال لیا کرے گا۔

پھر سعادت کو خود ہی "چپکے سے" کے الفاظ پر اعتراض ہوا۔ شاید اس لیے کہ رول ٹاپ پھر اٹھایا گیا تھا اور ایک خانہ میں مزید روپے ڈالے گئے تھے۔ باسط مسکرا رہا تھا اور سعادت بوکھلا رہا تھا۔ سوٹ قریب قریب تیار تھا... سعادت نے اپنی سبز فلیٹ کو ماتھے پر سرکایا اور باسط کے ہاتھوں کو نوٹ گنتے ہوئے دیکھا۔ سعادت نے سوچا "اگر میں ٹیلر ماسٹر ہوتا۔"

"کھنڈے"! ماسٹر باسط نے اپنے ایک شاگرد کو پکارا۔

ایک شاگرد سامنے آیا جس کا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ وہ بہت دُبلا پتلا اور نحیف و نزار تھا۔ اس نے گلوبند کے گرے ہوئے پلّے کو گلے میں ڈالا اور کٹے ہوئے ہونٹ کے احساس کی وجہ سے نیچے کا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کے

ساتھ بھینچنے لگا۔ اس نے گلو بند میں تھوڑا سا منہ چھپایا اور بولا "جی! بس تیار ہے اور کھنڈے کے کانوں میں طلائی بیر بلیاں تھیں۔ وہ مسلمان تھا لیکن وہ سونے کی ہندووانہ بیر بلیاں اس کے کانوں میں ایک ایسے سوال کی صورت لٹک رہی تھیں جس کا جواب ہندو اور مسلمان لیڈر دینے کے ناقابل تھے "شام کے صاحب" کی طرح اپنے منہ سے نکلتی ہوئی بھاپ کو دیکھتے ہوئے کھنڈا بولا "صبح سے انگلیاں سیدھی نہیں ہوئیں" اور اس نے انگلیوں کو دبایا اور بولا "پھر بھی آغا صاحب کو ساڑھے دس بجے تک سوٹ پہنا دوں گا"

سعادت نے خوشنودی کے اظہار میں سر ہلایا۔

ماسٹر باسط نے رول ٹاپ کے قریب ایک صاف سطح پر فلالین ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے فلالین پر ایک سفید خط ڈالتے ہوئے کہا "ہاں بس مجھے یہی کہنا تھا ـــــ"

سعادت اپنی جگہ اور اس کے ماحول کی منظّم سازش سے نکلا۔ آخر اُسے اور سوٹ تو سلوانا ہی نہیں تھا اس لیے وہ وہاں سے اُٹھ کر دکان سے باہر چوبی تختے پر ٹہلنے لگا اور بازار اور باہر کی غیر منظّم چیزوں کو دیکھنے لگا۔ بے ربط شور سننے لگا۔ دفتر جانے والوں کے ساتھ اب اسکول کی چھوکریاں بھی نکل آئی تھیں اور اپنے سبک پاؤں پر پھسلتی ہوئی کمیشن کے مخالف سمت چلنے لگیں۔ کہیں کہیں ایک دو جوڑے شاپنگ کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ چھڑے اور آئل کلاتھ کی دکان کا نوکر اور ایک کیمسٹ اپنی اپنی دکان کے بورڈ صاف کر رہے تھے۔

باسط کے ہاں دو اور نوجوان داخل ہوئے۔ ایک کا سوٹ سل چکا تھا اور دوسرا چسٹر کے لیے کپڑا لایا تھا۔ دکان کے اندر ایک درجن مشینوں کی

آواز کے ساتھ باسط کہتا ہوا سنائی دیا ——— دوڑ چودہ ——— کمر بتیس چھاتی پونے چھتیس ——— لیکن یہ چیز بھی باسط کو متوجہ کرنے کے لیے کافی نہ تھی وہ جمائی لے کر بازار کا غیر منظم اور بے ربط ماحول دیکھنے لگا۔ آخر پھر اُسے وہ ربط پسند آیا اور دکان کے اندر جا کر ڈائنا کی بجائے اس کے کتے کی طرف دیکھنے لگا۔ آخر انگریزی تہذیب کے مطابق بات کتے سے شروع ہوتی ہے اور پھر ڈائنا یا ایڈنا تک پہنچتی ہے۔

انگریزی کا مقولہ ہے ——— "مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو" اور یہ کتا لیلیٰ کے کتے سے سراسر مختلف ہے کیوں کہ ایک وقت میں لیلیٰ کا کتا ہوتا ہے یا لیلیٰ۔ دونوں ایک ساتھ نہیں ہوتے۔ سعادت نے پھر سوچا کہ تصویر اس دکان میں کس قدر موزوں ہے۔ لباس کی طرف اتنی توجہ آخر مغربی چیز ہے۔ ہمارے ہاں تو محبت کی خاطر محبت سکھائی جاتی ہے۔ بیوی سے کہو، تم اچھے کپڑے پہنو تو وہ کہتی ہے "میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے محبت تھوڑی ہے۔ محبت میرے کپڑوں سے ہے" انھوں نے مغربی فیشنوں کی تقلید سیکھ لی ہے، لیکن 'مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو، کا حسین مقولہ نہیں سیکھا۔

اب تک سعادت' باسط کا اور بھی قائل ہو چکا تھا لیکن .... اس وقت دو لڑکیاں جو ابھی دکان میں داخل ہوئی تھیں ایک چھوٹے سے کیس میں شیشے کے سامنے اپنا سراپا دیکھنے لگیں۔ ایک نے کوٹ سلوایا تھا اور دوسری نے شلوار اور قمیص۔ یہ بُت بولتے بھی تھے۔ ان کی وجہ سے کمرے میں ایک خوش گوار سی گرمی پھیل گئی تھی اور وہ سردی اور بے رونقی جو اس سے پہلے وہاں مسلط ہو چکی تھی، دور ہو گئی تھی ——— کھنڈے کا ہاتھ سیدھا ہو گیا

تھا اور دوسرے نوجوان کی پتلون کی کریز بہت حد تک درست ہو گئی تھی۔ اور سعادت کو وہ نوجوان بلانڈ اور برونیٹ کے ساتھ ہوا خوری کر رہے تھے، حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اور کیبن کی تصویروں میں کتا بہت پیارا معلوم ہو رہا تھا ــــ کتا ــــ کوٹ! کیوں کہ اس سیٹنگ میں مغربی رواج کے مطابق "لیلیٰ اور سگِ لیلیٰ۔ مجھ سے محبت کرو، میرے کتے سے محبت کرو" کے انداز میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کارنروان کی ڈائنا اس تصویر سے اتر کر کیبن میں چلی آئی ہے اور باسط کا رول ٹاپ آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔

"یہ پھندنا سا کیا لگا دیا ہے سوداں؟"

دوسری لڑکی جواب دیتی ہوئی دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ پہلی لڑکی جس کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی، کا منہ آئینہ میں نظر آنے لگا اور سعادت ایک جذبے کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دوسری لڑکی بولی۔ "ارے رواج ہے۔ پیٹھ پر بھی پھول سا ابھار دیتے ہیں اور سینے پر بھی! مجھے تو تمھارا کپڑا بہت پسند ہے۔"

"نرا ٹاٹ معلوم ہوتا ہے ــــ سِلا اچھا ہے، باسط جو ہوا . . ."

دونوں ایک دوسرے کے کپڑے اور سلائی کو بہتر سمجھتی تھیں۔ لڑکی جس کا نام سوداں ــــ مسعودہ بیگم تھا اس نے اپنے بال کوئن کرسٹانا کی طرح بنائے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا چہرہ لمبا کم تھا اور چوڑا زیادہ تھا اور یوں توازن قائم رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے قدرتی بلوریں سرمے کی ہلکی سی تحریر دکھائی دیتی تھی ــــ وہی "مجھ سے محبت کرو۔ میرے کتے سے محبت کرو" انداز کی ــــ

دوسری لڑکی رمنر کی طرح کم گو اور تیکھی تھی۔ ٹھوڑی اور منہ کے درمیان

ایک پھوڑے کا ہلکا سا داغ تھا لیکن اتنا ہی جتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ اور ایک خوب صورت استناعی حکم والے چہرے سے کم ہوتا ہے۔ اس کا نام سلطان تھا بہتی ہوئی لکیروں والا کوٹ اس کے جسم کے اُبھار پر ابھرتا اور دباؤ پر دبتا پنڈلیوں کے وسط تک چلا آیا تھا۔ چھاتی پر خوب صورت قوسین بن رہی تھیں سعادت قوسوں کے لیے زکی الحس واقع ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر چھاتی اور کمر کی قوسوں کی طرف دیکھنے لگا۔

سعادت سلطان اور سوداں کو دیکھتا رہا حتیٰ کہ ان لڑکیوں کو اپنی بے پردگی کا احساس ہونے لگا۔ سلطان نے بڑھ کر ہاتھ مارا اور پلائی وُڈ کے کمرے کا پردہ پیتل کے چھلّوں کو پورے پھیلاؤ میں لے کر تن گیا۔ صرف ایک معمولی سی درز باقی رہ گئی۔

اس وقت کھنڈا سعادت کا سوٹ لے کر آیا اور ایک علاحدہ کیبنٹ میں لے جاکر پہنانے لگا۔ سعادت کے فیلٹ کو سیدھا کیا، تاکہ وہ ایک شریف انسان نظر آئے۔ اور اس نے جلدی جلدی نیا سوٹ پہنا۔ سوٹ بالکل درست تھا لیکن سعادت نے اس بات کا اعتراض ضروری سمجھا۔ کاروباری طور پر یہ بات درست نہ تھی "بغلوں کے قریب دبتا ہے" اس نے کھنڈے کو دکھاتے ہوئے کہا "اور یہ دیکھو فال سیدھی نہیں پڑتی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ مجھے جلدی ہے۔

کھنڈے نے گھٹنوں کے قریب سے قینچی سرکائی۔ انگشتانہ اتارا اور سوٹ کی جیبوں سے تمام کچے دھاگے نکال دیے۔ اس وقت لڑکیوں نے کھنڈے کو اشارے سے بلایا۔ کھنڈا معذرت کیے بغیر اُدھر چلا گیا۔ لیکن سعادت نے احتجاج نہ کیا۔ کھنڈے کی وجہ سے سعادت اور ان لڑکیوں میں ایک رابطہ پیدا

ہو گیا تھا۔ سعادت کے پاس سے اُن لڑکیوں کے کیبن تک جانے میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان دو جگہوں کے درمیان ایک غیر مرئی خط لگ گیا ہے.... اور یہی خط ہیں جو راستہ کاٹتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں.

لڑکیوں کے کیبن میں بے احتیاطی سے داخل ہونے پر پردہ سرک گیا۔ اب سلطان کی پیٹھ سعادت کی طرف تھی۔ وہ پنجابی قمیص پہنے ہوئے تھی اور کمر کے نیچے قوسین بڑی بڑی اور کچھ خوفناک تھیں۔ ان لڑکیوں نے پردے کو اٹھا رہنے دیا. شاید ان کی بے احتیاطی تھی وہ سیدھا تکنا نہ چاہتی تھیں اسی قدر بے حجابی کے ساتھ، جیسے سعادت دیکھ رہا تھا۔ لیکن سعادت کیا کر سکتا تھا۔ مرد کا انداز ہی کچھ سیدھا سیدھا، اُجڈ اُجڈ ہوتا ہے۔ لیکن عورت نگاہیں جھپکا کر ڈالتی ہے۔ جیسے اس کا جسم حسین قوسین کا مجموعہ ہے ویسے ہی اس کی نگاہیں اور اس کے افعال....

سعادت کے جسم میں خون حرکت کرنے لگا۔ اسے اپنے کانوں کے کنارے جلتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ کھنڈے نے لڑکیوں کے کیبن میں داخل ہوتے ہی سلطان کا کوٹ کھینچا اور پھر اپنے آپ ایک بازو کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔ "یہ کالر کیسے ہے، ذرا ٹھیک کر دو" سلطان بولی۔ کھنڈے نے ہاتھ بڑھا کر کالر ٹھیک کر دیا اور پھر باہر نکلتے ہوئے بولا: "بس بی بی جی۔ آپ کو کوٹ ایسا پسند آئے گا ـــــ جیسے.... کبھی پسند نہیں آیا" کھنڈا رُک گیا اور بڑے زور سے دونوں ہونٹ بھینچنے لگا۔ اس وقت لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔

یہ سازش تھی، سب سازش تھی ـــــ سعادت نے کہہ دیا، صاف کہہ دیا۔

لیکن وہ کوٹ اتار کر خود کچے دھاگے اُتارنے میں مصروف ہوگیا۔ وہ ابھی تک اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ مسعودہ نے بھی اپنا کوٹ اُتار دیا تھا وہ کہہ رہی تھی" باسط صاحب،

باسط نے حساب کتاب کا رجسٹر وہیں پھینکا اور کیبن کی طرف آیا ایک لڑکی نے کپڑے کے ایک پلندے کو اٹھاتے ہوئے کہا" ہمیں اور بھی کپڑے سلوانا ہیں، لیکن ایک شرط پر۔ آج سے دوسرے ہفتے کے روز مل جائیں۔ مسعودہ بیگم کی شادی ہے"

مسعودہ شرما گئی اور کہنے لگی "یوں کپڑے مانگ لیتی ایک خاص تاریخ کو —— میری شادی کا ذکر بھی کیا اتنا ضروری ہے کہ دنیا بھر۔ ۔ ۔ ۔"

"چلو ہٹو —— ہٹو ——" سلطان نے کہا:

باسط نے مسکرائے بغیر کہا" شنیل ہے —— شنیل، کے گز لائیں کپڑا آپ؟"

"ایک گز عرض ہے۔ اور ساڑھے چھ گز ہے۔"

باسط اور کھنڈا دونوں کھڑے تھے۔ کھنڈے نے ایک نظر سے سوداں کے تندرست جسم کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو ——" پونے سات گز ہو جاتا تو اچھا تھا" لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ شاید کھینچ کھانچ کر غرارا ہو جائے گا۔ مسعودہ کا چہرہ ابھی تک گلابی ہو رہا تھا۔ باسط نے آگے بڑھتے ہوئے سلطان سے کہا۔

"آپ کی قمیص شلوار کا ماپ تو ہے —— مگر ان کا؟"

مسعودہ نے کہا" تو ماپ لیجیے ——"

باسط نے کچھ دور جا کر اپنے رول ٹاپ کی چابی گھمائی اور اسے گچھے سمیت اچھالتے اچھالتے ادھر چلا آیا۔ کمرے کے پاس پہنچتے ہی ماسٹر باسط نے

گلے سے فیتہ نکالا اور بولا

"آپ ذرا ہاتھ اٹھائیں۔"

مسعودہ بیگم نے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور سعادت کے گلے میں لعاب خشک ہوگیا۔ مسعودہ سامنے کھڑی تھی۔ ایک خوب صورت عورت ـــــ اپنی تمام قوس و قزح کے ساتھ۔ لیکن ماسٹر نے مسعودہ بیگم کے پیچھے سے فیتہ نکالا اور بولا۔ "کھنڈے لکھ لے۔"

"چھاتی اڑتیس۔"

پھر کمر بتیس... کراس بیک پندرہ، باز و بارہ، کلائی ساڑھے چار اور قمیص کی لمبائی کیا رکھوائیں گی آپ؟ ـــــ گز سے اوپر؟ ـــــ رواج نہیں ـــــ خیر پسند اپنی اپنی ـــــ شنیل اچھی ہے، اچھا انتخاب ہے ـــــ لیکن اس کے ماپ کی کیا ضرورت ہے؟ ـــــ اور شلوار ـــــ یہ فیتہ رکھیے، ہاں ہاں رکھیے اور فیتے تو مسعودہ بیگم کے گلابی پانو پر چھوڑتے ہوئے باسط اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے فیتے کو گلے میں ڈالا اور چلتا بنا۔

"عجیب ہونق ہے!" سعادت نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے سوچا "کتنا جذبات سے کورا ـــــ غیر شاعرانہ انسان ہے ـــــ اتنا بھی نہیں کہ ان خوب صورت قوسوں، ان گولائیوں کو دیکھ لے..."

اور سعادت مبہوت کھڑا سلطان اور مسعودہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی ہوئی چل دیں۔ سعادت کو کچھ یاد آیا اور اس نے ماسٹر باسط کے رول ٹاپ پر ساٹھ روپے رکھے، اور گھبرا کر باہر نکلا ـــــ انگلش واچ کمپنی کا کلاک پونے بارہ بجا رہا تھا اور انٹرویو کا وقت گزر چکا تھا ـــــ!

ماسوا

بغلی کمرے سے ہنسی کی آواز آئی۔

میں بدستور اپنا کام کرتا گیا اگرچہ "جیتی بی بی" بھی برابر ہنستی گئی جیتی کا کیا تھا وہ تو ہنستی ہی رہتی تھی ۔ ۔ ۔ ایک عام بات، جس پر کوئی مسکرانا تک گوارا نہ کرے جیتی کے لیے بڑا ہنسوڑ لطیفہ ہوتی تھی ——— "دیکھیے جی یہ ٹوپ چھڑی پر لٹکا وا ہے یا نہیں اور یہ چھڑی نہیں آدمی ہے" ——— آدمی! اور جیتی کو ہم پڑھے لکھوں کے بلجھے ہوئے "مزاح" نے خراب نہیں کیا تھا۔

جیتی بی بی کے ہنسنے کی آواز میرے لیے غیر متعلق شور ہو کر رہ گئی تھی۔ متعلق اور غیر متعلق شور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میں ایک دوست کے نام خط لکھ رہا ہوں جس میں مجھے ایک بدگمانی کو دور کرنا ہے۔ نہیں خط کو جانے دیجیے، شاید اس سے میرا مفہوم واضح نہ ہو سکے۔ فرض کیجیے میں ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ چاند تاروں کے متعلق ایک نظم۔ جو ہمارے شاعر اکثر لکھا کرتے ہیں اور جس میں دھندلکے، اجنبی، ان گنت، مبہم، بے نام خلا وغیرہ کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے، لیکن پڑوس کے سردار فتح "موںہہ، تو بلیاں والے" کیرتن سوہلا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں ——— "گگن میں تھال روی چند دیپک

بنے تار کا منڈلاجنک ہوتی" تو اگلے ہی لمحے سارا آسمان ایک وسیع و عریض تھال کی صورت میں سامنے آجاتا ہے جس میں چاند اور سورج دیے بن جاتے ہیں اور تارے ان گنت موتیوں کی طرح تھال میں پڑے نظر آنے لگتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایسے ہی وسیع و عریض پیمانے پر بھوکنڈٹن کی آرتی اتر رہی ہے اور پون کا جسیم چنور دھوپ ملیان کی صورت میں ہل رہا ہے ..... اب اتنی حسین منظرکشی کے بعد چاند تاروں کے متعلق کوئی کیا لکھے گا؟ برخلاف اس کے سامنے کے سروس اسٹیشن سے دن رات کاریں چلنے کا شور سنائی دیتا ہے اور مستری بجلی کے فوارے کے ساتھ فحش کلامی بھی کرتا ہے۔ لیکن میں لکھ سکتا ہوں، پڑھ سکتا، سوچ سکتا ہوں، بلکہ ایسا شور مجھے زندگی کا قرب، ایک قسم کے تحفظ کا احساس اور ــــــ نظم اس کے سوا دیتا ہے۔ اور یوں غیر متعلق شور میرے لیے ممد و معاون ثابت ہو جاتا ہے.....

لیکن آہستہ آہستہ جلیتی کا شور "متعلق" ہو رہا تھا ــــــ "کس کا دیا کھاتی ہوں ــــــ ان کا؟" اور پھر ایک بڈھے کی نامانوس آواز آئی۔ ہمارے گھر میں یہ دوسرا بوڑھا کون ہو سکتا ہے۔ یہ جلیتی کے والد کی آواز نہ تھی۔ وہ ہمارے ہوتی بازار میں آتے تھے لیکن گاہے ماہے اور وہ بھی قدامت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی جلیتی کے گھر کا کچھ نہ کھاتے اگر کہیں زبردستی کوئی سنگترے کی پھانک منہ میں ڈال دے تو پورے سنگترے کی قیمت رکھ دیتے ادھر ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے اچھی خاصی تجارت ہو سکتی ہے اور پھر جب وہ اپنی بیٹی کو نوکروں پر رعب جماتے اور بچوں کو آیا کی گود میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں پانی آجاتا اور وہ پیار کا کوئی شبد کہے بغیر چل دیتے، آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب اپنا آپ بچوں کی صورت میں سکھی ہو جاتا ہے تو پھر سوت پر کیوں نہ

کوئی شادیانے بجائے ... لیکن وہ بڈھا کوئی اور تھا ورنہ بابو جی میرے سُسر ایسے بلغمی مزاج کے نہ تھے اور یوں ہنستے تھے جیسے کوئی آواز نکل کر ایک تھیلے میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر جیتی کی آواز آئی ــــــ "ان کا دیا کھاتی ہوں یہ تو مجھے پہلے ہی پتا تھا ــــــ کچھ اور بتاؤ؟ ... اور ہنسی ...

میں اپنے کام کو ٹالتے ہوئے بغلی کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے تک جانے کی نوبت ہی نہ آئی دونوں کمروں کے درمیان غسل خانے کے سامنے چھتا ہوا ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جو زمین سے دو تین فٹ اونچا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر جس پر مشکل سے کوئی بچہ بیٹھ سکے، جیتی بیٹھی اپنا ہاتھ اس بوڑھے کو دکھا رہی تھی۔ بوڑھے کا رنگ سُرخ تھا اور اس کے سر پر بے احتیاطی سے بندھی ہوئی گیروی پگڑی سے مطابقت رکھتا تھا، اس کی ڈاڑھی مونچھیں سفید ہونا چاہیے تھیں لیکن کثیف سے تیل کے استعمال نے انھیں پیلا بنا دیا تھا .... "بیٹا ہنسو مت۔ تمھارا ہاتھ ہل جاتا ہے" ــــــ وہ کہہ رہا تھا اور ایک حقیر سے وقفے کے بعد سر کو جھٹکا دیتا تاکہ پگڑی پیچھے نہ گر جائے۔ سر سے پانو تک جوگی ہونے کے باوجود اس کی نسل سادھوؤں اور سپیروں سے یکسر علاحدہ تھی۔ اس میں کوئی ایسی بے نیازی نہ تھی اور نہ ہی تکرار طلب۔ دودھا دھاری ہونے کے باعث دودھ ہی پر گزارہ کر لیتا تھا ــــــ وہ خوش تھا ــــــ خوش! بالکل کائنات کا باپ بن کر، جیتی کا ہاتھ تھامے ہوئے بولا ــــــ

"یہ مارس کا گرڈل ہے" وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا:

"یہ ریکھا جو ادھر جاتی ہے، اس کا مطلب ہے تم ٹریول بھی کرو گی۔"
"کدھر جاؤ نگی؟" جیتی پوچھ رہی تھی وہ کہہ رہا تھا ——— سمندر کا سفر نہیں، یوں کچھ جاترا معلوم ہوتی ہے۔"
میں نے کہا ——— "جیتی تم اتنا شور مچا رہی ہو کہ میں ۔ ۔ ۔ ۔"
ابھی میں نے فقرہ بھی پورا نہ کیا تھا کہ جیتی منہ پھلا کر دھڑ چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ تمھیں تو بس منڈیوں کے بولنے کی آواز بھی روک دے گی۔" اس وقت تک وہ بوڑھا رمال اور پامسٹ میری انگلی پکڑ کر مارس کے گرڈل پر رکھ چکا تھا۔
مانتا ہوں ہمارے سماج میں خاوند کا کھوج جلد جاتا ہے۔ لیکن جس آسانی سے وہ بڈھا مجھے جیتی کا شوہر سمجھ گیا تھا یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی اور پھر وہ یوں باتیں کرنے لگا گویا مجھے برسوں سے جانتا ہے۔ وہ فوراً میرے ساتھ ایک رشتے میں داخل ہو چکا تھا، اس بات کو جانے بغیر کہ میرے باوا کے باوا کا باوا ۔ ۔ ۔ یہاں کچھ عقل گم ہو جاتی ہے ورنہ مجھے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی عورت بھی میری بیوی ہوتی تو اس کی وضع قطع جیتی ایسی ہوتی۔ دس برس ہوئے مجھے بابوجی کا داماد بنے ہوئے لیکن جب سے بابوجی پیدا ہوئے میں ان کا داماد تھا۔
تو مارس کے گرڈل کا مطلب تھا کہ کام کرو گے اور کھاؤ گے۔ میں نے کہا، اگر یہ گرڈل جیتی کے ہاتھ میں ہے تو اس نے دو تین نوکر رکھے ہیں جن پر حکومت کرتی ہے اور خود پلنگ پر بیٹھ کر موزے بنتی ہے، اپنے خاندان کے لوگوں کے موزے ختم ہو جاتے ہیں تو اڑوس پڑوس کے شروع کر دیتی ہے۔"
جیتی بول اٹھی "نوکر تو نام ہی کے نا۔ سارا دن ان سے مغز کھپائی ہوتی ہے، کوئی کام اپنے آپ بھی کرتے ہیں؟" ——— تو یہ بھی گرڈل کی تشریح اور پھر

ہوتے۔ ۔ ۔ ۔ اگر اس کے ہاتھ کی ریکھا میرے ہاتھ کے ساتھ بڑھی جائے تب کہیں وضاحت ہو تی تھی۔

لیکن جیتی خوش تھی ـــــ خوش اس بڈھے کی طرح۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا ہی قریب تھے جتنا میں ان سے پرے تھا۔ میں ہر روز آسمان سے زمین پر آتا تھا۔ یہ لوگ تھوڑا بہت بھی آسمان کے طرف جاتے تو بے حد خوش ہوتے لیکن میرا آسمان بتدریج اونچا ہو رہا تھا۔ جیتی کے لیے یہ بات پریشان کن نہ تھی کہ وہ میری قسمت کا کھاتی ہے۔ عورت اور کمائی! کچھ طوائفوں ایسی بات معلوم ہوتی ہے، باوجود اس بات کے کہ میرے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا تھا مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ لیکن یوں نہ اچھا لگنے میں جو اچھا لگتا ہے اس نخوت کا کوئی کیا کرے۔

تو بڈھے نے جتنی باتیں بتائیں وہ ایسی تھیں کہ ہم ان پر یقین کرنا پسند کرتے تھے، کہیں تھوڑا بہت ردّ و بدل ہوتا تھا لیکن وہ ہمیں پریشان کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ روی وار کے دن جو ہم کالی گائے لائے ہیں، یہ پھلے گی نہیں شاید اسی لیے بچھڑا مر گیا تھا اور سوا لگوانے کی وجہ سے گائے کا ایک تھن ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا تھا۔ لیکن ایسی بات کو صرف ایک اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے اور انسان صاف کہہ سکتا ہے اس کا قسمت سے کوئی سمبندھ نہیں البتہ دوسری بات جو تشویشناک ہو سکتی ہے، وہ یہ تھی کہ لوگ بڑا ہو کر ہمیں تنگ کرے گا۔ سو ابھی آٹھ دس سال پڑے تھے لوگ کے بڑا ہونے میں۔

بر خلاف اس کے ہمارے حق میں کتنی باتیں تھیں۔ قسمت کی لکیروں اور دماغ کی ریکھا کو کاٹتی ہوئی شہادت کی انگلی کی طرف جھکتی تھی۔ وہاں 'زحل' کی ایک 'پہاڑی' تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی بھر ہمیں معاش کی فکر نہ ہو گی اور آخری عمر میں "راج دربار میں بڑا مان" پائیں گے۔ یہ بات بھی مجھے

اچھی نہ لگی، خیر۔۔۔ دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ بابوجی کی آواز تھی۔ انھیں کا انداز تھا کہ دروازے کے شیشوں پر چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے اور کسی کا نام پکارنے کے بجائے ایک رینگتی ہوئی آواز میں ہری او۔۔۔۔۔و۔۔۔۔۔م کہتے۔

آج بابوجی نے پگڑی بھی ایسی باندھی تھی جس پر شلوک لکھے تھے۔ ایسی پگڑیاں ہردوار میں ملتی تھیں اور ان کے ایک پلّو میں میٹھے چنے، پھنے ہوئے چاول پرشاد کے طور پر ملتے تھے۔ آج چھڑی بھی مختلف تھی۔ یہ شکھ چین لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس پر پھوڑے ہی پھوڑے نظر آتے اور یہ چھڑی گھر میں سانپ بھگانے کا بہترین نسخہ تھی۔ جیتی اپنے پوجیہ پتاجی کی طرف متوجہ ہوئی اور بڈھا اٹھ کر کھڑا ہوگیا گویا وہ پیسے نہیں لے گا، البتہ اخبار والے اور کوئلے والے کی طرح مقررہ تاریخ پر چکانے آئے گا لیکن میں کچھ نقدی اس کی مٹھی میں تھما چکا تھا۔

"یہ میں نہیں لوں گا بیٹا۔" اس نے کہا۔

"کیوں بابا کیوں نہیں لوگے؟"

بڈھے نے اپنی رمل اور وہ کتاب جس پر ہندی کے بے شمار زائچے بنے ہوئے تھے، اٹھائی، اسے جھاڑا، چوما، آنکھوں اور سر سے لگایا اور اپنی جھولی میں رکھ لیا، اس وقت تک اس کے چہرے سے خوشی زائل ہو چکی تھی اور اداسی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بوڑھا ان لوگوں میں سے تھا جو خوشی کے وقت خوش اور غمی کے وقت غمگین ہوتے ہیں۔ ایک دن میں دس بار ہنستے اور پانچ چھ بار رو بھی لیتے ہیں اور ایک ہی تاثر کو مستقل نہیں ہونے دیتے۔ بڈھے نے کہا بیٹا! میں پیسے نہیں لوں گا، جو خبر میں تمھیں

سنانا چاہتا ہوں وہ اچھی نہیں ہے ـــــ ہاتھ دکھاؤ"

جیتی کے والد اس اثنا میں بڑے اطمینان کے ساتھ کشمیری آسن پر براجمان ہو چکے تھے جیتی انھیں بابا کی باتیں سنا کر ہنس رہی تھی، بوڑھے نے منفا ہمت کے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ایک قہقہہ کہیں ہتھیلی میں گم ہو کر رہ گیا۔ پھر بوڑھے نے سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے کہا "بیٹا! برا تو نہیں مانو گے، اداس تو نہیں ہو گے" میں نے کہا "بابا جتنا میں اداس نظر آتا ہوں اس سے زیادہ اور کیا ہوں گا؟..." "نہیں نہیں" بڈھا ہنسا.... قریب بابو جی یوگ کی باتیں سن کر اس سے لاڈ کر رہے تھے.... باہر جو دروازہ اندرونی صحن میں کھلتا تھا، حویلیاں والے سردار کی آواز اس میں سے ہو کر آرہی تھی۔ وہ گا رہے تھے ـــــ لال رنگ تس کو لگا ـــــ لال رنگ اسے لگتا ہے جو بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے مصرع کا موضوع تھا لیکن بڈھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ ہنستی کھیلتی عورت چپکے سے چل دے گی"

میں نے گھبرا کر کہا "کیا؟"

بڈھے نے نقدی واپس میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "جیتی بہت دیر جیتی نہ رہے گی اور..."

"اور؟"

"اور تمھاری دوسری شادی ہو گی!"

یوں تو میں ہر اس بات کو مان لیتا ہوں جس کے لیے میں نے دام دیے ہوں، لیکن سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوتا ہوں جس کے لیے کوئی دام قبول نہ کرے۔ کوئی آدمی چیز دے اور چل دے تو یہ چل

دنیا ہمیں کتنا مربیانہ معلوم ہوتا ہے ـــــــ حویلیاں والے کی آواز نے مجھے جھنجھلا دیا تھا بوڑھے کی بتائی ہوئی خبر لال رنگ نہ ہو سکتی تھی، لیکن میں اپنے کام کو چھوڑ کر سروس اسٹیشن کے سامنے بوڑھے کو جاتے دیکھا کیا۔ اس کی بغلوں اور اس کی چھاتی پر خاصی چربی ہونے کے باعث بوڑھے کے بازو بہنگی کے انداز میں ہل رہے تھے وہ کھڑا رہتا تو میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا لیکن اس نے بات کہی اور چل دیا!..... وہ سرخ اور سفید، بھاری بھرکم آدمی اس قدر زندہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے موت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی ـــــــ وہ چلا گیا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بوجھ سے دبی ہوئی بیمنٹ کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اپنی سطح پر آرہی ہیں۔ کوئی تیز لانچ پانی سے گزر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس بوڑھے کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آرہا تھا اور ارد گرد کی فضا اس گھاؤ کو پاٹنے کے لیے چاروں طرف سے اُمنڈتی دکھائی دیتی تھی۔

آج سروس اسٹیشن خاموش تھا، اسلامی بھائی ہونے کے باعث سروس اسٹیشن کا مالک جمعہ کے دن دُکان بند رکھتا تھا۔ سو آج وہاں کچھ بھی نہ تھا چند آوارہ کتے ایک مریل سے کتے کو ڈھکیلتے ہوئے کاروں کے پلیٹ فارم کے نیچے خالی جگہ میں گھس گئے تھے۔ اور اسی دم چلے بھی گئے۔ تو گویا وہاں فقط اس سروس اسٹیشن کی عمارت کھڑی تھی۔ جس کے پیچھے سیلو بیر کا اکیلا درخت پچھلے روز کی بارش میں دُھلا ہوا، اپنی سرسبزی سے آنکھوں میں کھپا جاتا تھا۔ بائیں طرف جنگلے کے پیچھے ہوا بھرنے والی موٹر نظر آرہی تھی اور اس پر ایئر یعنی ہوا کے حروف انگریزی میں اتنے موٹے لکھے ہوئے تھے کہ ان کے

لکھے ہونے میں خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا۔۔۔
بوڑھے نے بات کہی اور چل دیا!۔۔۔ وہ ابھی تک بازار میں اس جگہ پہنچا تھا، جہاں رنگ ریز اور ان کے شاگرد مل کر پگڑیاں سکھا رہے تھے، بوڑھا دم بھر کے لیے صافے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اسی دم پھر سامنے آ گیا۔ ابھی وہ یکے سے بچنے کے لیے گلی کی پناہ میں گیا ہی تھا کہ دو بچے لڑتے ہوئے بوڑھے سے بھڑ گئے۔ بوڑھے کی پگڑی پیچھے کی طرف سرک گئی، جسے اس نے ٹھیک کیا اور بچوں کو چمکار کر آگے چل دیا ——— آخر اسے نظروں سے اوجھل ہونا تھا سو وہ ہو گیا۔
رسوئی سے پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی، شاید آیا کے ہاتھ سے گری تھی۔ چونکہ اُسے اکثر بے احتیاطی کے باعث ڈانٹ پڑتی اس لیے اس کے ہاتھ کانپتے رہتے تھے۔ نوکروں کے کواٹروں میں جو تیل کا لیمپ جلایا جاتا تھا اس کی چمنی دو تین چار بار پھوڑ چکی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جیتی نے پھر سے اس کا پلیٹ توڑنے کا قصور معاف کیا ہے، کاش پہلی بار جب اس سے چیز ٹوٹی تھی، اس وقت کوئی اس کے گناہ کو معاف کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی ۔۔۔ ہری اوم کی آواز کے ساتھ بابو جی کے پیٹ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلی جو پیٹ کے یکسر خالی ہونے پر پیدا ہوتی ہے یا بہت کھا لینے کے بعد سننے میں آتی ہے۔ ساتھ ہی پتا چلا کہ مجھے پکارا جا رہا ہے۔

میں نے کہا "جی، آپ مجھے بلا رہے ہیں؟"
"ہاں بھاگیرتھ، بات سنو" ——— جیسے میرے اپنے انداز سے آواز آئی "جیتی کو کہو ورزش کیا کرے۔"
"ورزش کیا کرے؟ وہ تو پہلے ہی گھر کے کام کاج تلے دبی ہوئی ہے۔"

"لیکن بابو جی —— نوکر بھی بھلا اپنے کام کرتے ہیں۔ جب تک بیوی خود ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، کون جان مارتا ہے اب جو یہ سب پنکھے، جھلکورے قرینے سے دھرے ہوئے ہیں، نوکروں نے دھرے ہیں؟ ننگا سر لگ کر صوفے کی پشت میلی ہو جائے، کیا مجال جو نوکر کہیں اس پر کپڑا ڈال دیں یا اسے پکڑ کر دھو ڈالیں۔"

"تو یہ دھونے دُھلانے کا کام کون کرتا ہے؟

"جیتی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، بیٹا، اصل ورزش تو یہی ہے نا کہ بنا مطلب ناپتے پھرنا شہر کی گلیاں سیر کے بہانے۔"

"عورت کے لیے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے۔ جس سے اس کا شریر گٹھا رہتا ہے، اور وہ بیمار نہیں ہوتی، کپڑے دھونے سے بازوؤں اور چھاتی میں طاقت آتی ہے، کام نہ کیا تو موٹی ہو جائے گی؟

جیتی کو پتا چلا تو وہ بدستور ہنستی ہوئی باہر آئی —— "بابا جی آپ بھی حد ہیں۔ آپ کو چاہیے میری طرفداری کریں۔ آپ الٹا مجھے کام کرنے کے لیے کہتے ہیں تو میں کام نہیں کرتی؟ سارا دن سینا پرونا، کتر بیونت کے علاوہ کپڑے دھونا، حتیٰ کہ برتن بھی مجھے ہی مانجھنا پڑتے ہیں، گن آنند کی تو یہ کوشش ہوتی ہے، ذرا بی بی آنکھ ادھر کرے اور وہ جھٹ سے سارے جھوٹے برتن گرم پانی میں ڈال دے اور مانجھے نہیں اور جھاڑ پونچھ کر برتونی پر لگا دے۔"

"تو خود کام کرتی ہے، یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی" —— بابو جی کہہ رہے تھے لیکن ایک بات سے انھیں بھی اتفاق تھا کہ برتن نہیں صاف کرنے چاہییں، وہ بہو بیٹی سے سر دبوانے، جوتا اٹھوانے، چلم بھروانے اور ایسے پنچ کام کروانے کے خلاف تھے، نہ اپنے نیچے کا کپڑا کسی بہو بیٹی کو دیتے نہ ان کا

اپنے بدن سے چھونے دیتے، کہنے لگے ضروری ضروری کپڑے آپ دھونے چاہییں اور جو بہت ہو جائیں تو ایک کی جگہ دو دھوبی لگائے جائیں۔ ایک کو دوسرے کے اوپر لگا یا جائے تو یہ لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور مالک سکھی ہو جاتا ہے ——— خوب اُپج تھی!

جیتی نے انگلیوں سے یوگ کی مانگ بناتے ہوئے کہا۔" وہ ریکھا وِددان آیا تھا، کہہ رہا تھا۔ ہاتھ میں لکھا ہے کام کرو گی تو کھاؤ گی۔"

" نہ کرو گی تو بھاگیر دتمھیں کیا کہنے چلے گا ؟ بابو جی نے میری وکالت کی۔

جیسے کچھ دیر روشنی کی طرف دیکھتے رہنے سے ہر چیز پر ایک لال، نیلا اور کالا سا دھبہ نظر آتا ہے اور نگاہ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے، اسی طرح اس بوڑھے کی روشن باتوں نے یوگی، جیتی اور بابو جی کے چہرے کو ایک منحوس رنگ اور دھبے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ کبھی کبھی جیتی کی شکل صاف نظر آتی وہ کتنی بھولی دکھائی دیتی ——— اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں، ——— وہ ہنستی رہتی تھی۔ میں نے اس کی ہنسی کو کچلنے کی بہت کوشش کی، اس کی مسکراہٹ کا جواب میں نے تیوروں سے دیا اور ہنسی کا جواب خفگی سے لیکن وہ ہنستی رہی۔ کیا موت اس ہنسی کو کچل دے گی؟ . . . وہ بوڑھا رمال میرے دل کے تالاب میں ایک وزنی پتھر پھینک کر چلا گیا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا، جیسے کثرت تلاطم سے میرے دل کے کنارے دل کے اندر گر رہے ہیں۔

" گن آنند ——— ارے " گن آنند " میں نے اپنے آپ سے بچنے کے لیے آواز دی۔

" جی ہو "

گن آنند ایسے ہی بولا کرتا تھا ——— " جی ہو " میں نے کہا، " جی ہو " کے

بچے، باجی کے لیے حقہ ڈال دے۔ جواب میں پھر جی ہوں کی آواز آئی۔ اس اثنا میں بابوجی اپنی جیب سے تمباکو نکال چکے تھے اور میری طرف بڑھا رہے تھے، پڑوسیوں کا موزہ، جیتی کی سلائیوں پر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسری سلائی ڈالتی اور دایاں بایاں ہاتھ اکٹھا جھٹکتی تو ساتھ ہی اس کے پتلے نمدار ہونٹ سمٹ جاتے، میری نگاہوں کے قریب سے کہیں ایک کرن اس کے ہونٹوں پر پہنچ کر کھیل جاتی ـــــ اس وقت وہ بابوجی کی طرف اشارہ کرتی اور میں چھپ جاتا۔ پہلے میں جیتی بیٹی کو دیکھ رہا تھا، پھر جیتی ماں کو دیکھنے لگا ـــــ اب میرے سامنے جیتی تھی ـــــ عورت .... میری نگاہیں اس کے خوبصورت جسم اس کے بت کی پیمائش کرتی ہوئی کولھوں پر اڑ گئیں۔ درزی نے باناتی میں سے دو دو ریشے کھینچ کر کمر کے قریب قمیص کو کس دیا تھا اور جیتی کے اوپر اور نیچے کے جسم کی حد بڑی صفائی سے باندھ دی تھی۔ درمیان کا جسم کپڑے کے نیچے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا ایک بھوری سی بلّی آگ کے پاس سے اُٹھ رہی ہے اور کمر کو باقی جسم سے اوپر اُٹھا کر کھڑی اکڑ رہی ہے ... اور اس کے بعد یوں نظر آنے لگا جیسے بہت بڑے پیندے والی ستار پڑی ہے ..."

اس وقت تک گن آنند بابوجی کے لیے حقہ ڈال چکا تھا بلکہ بابوجی بھی تمباکو چلم میں پھینک چکے تھے، جیتی میری نگاہوں کی تاب نہ لاکر شرما چکی تھی بیٹی اور ماں کی صورت میں جو وقار جیتی کے چہرے پر ہوتا تھا ایسا ہی وقار عورت ہونے پر بھی قائم رہتا، بلکہ وہ کبھی یوں سر اٹھاتی جیسے کہہ رہی ہو ـــــ میں ہوں! لیکن میں اپنی نگاہوں کی فحاشی سے اکثر اسے اس کے مفعول ہونے کا یقین دلا دیتا اس وقت وہ نہایت بے بس ہوتی اور میں اچھے ہتھیاروں کی مدد سے وہ لڑائی جیت لیتا ورنہ قاعدے کی لڑائی میں عورت سے کون

کبھی جیتا ہے؟

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نئے سرے سے اپنے دوست کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کے نام ایک بے سر و پا لمبا چوڑا خط لکھا، کیوں کہ میں اس کی دوستی کی قدر کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ محض اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائے کہ میں نے ایک معمولی سی پارٹی میں اس کا تعارف عورتوں سے نہیں کروایا۔ میں جانتا ہوں وہ اس محفل میں محض چائے پینے کی غرض سے نہیں بلایا گیا تھا اور مجھے عورتوں کے علاوہ اس شام کے مہمان کے ساتھ بھی اسے ملانا چاہیے تھا لیکن قصہ یہ تھا کہ میں تو مہمانوں کے سواگت میں لگا ہوا تھا اور یہ تعارف کا کام کسی دوسرے کے سپرد تھا۔ یا شاید میں نے اپنے دوست کو بہت اپنا بھی سمجھ لیا تھا اور اس لیے بنا جانے بوجھے مجھ سے یہ غلطی ہوئی....

لیکن میں بہت دیر تک خط کے متعلق سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور دائیں طرف کے مکان میں اوپر کے فلیٹ پر روشنی اور سائے آپس میں گھل مل گئے تھے، کمروں میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں فقط کچھ دوپٹے اِدھر اُدھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے، سامنے سڑک پر پل بھر کے لیے بتی جلی اور پھر بجھ گئی معلوم ہوتا تھا بجلی کمپنی والوں نے آزمائشی طور پر ان بتیوں کو روشن کیا ہے۔ میں پھر جیتی کے متعلق سوچنے لگا ــــــ مجھے دوسری شادی کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔

میں نے قلم کو میز پر رکھا اور کرسی میں اکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو اپنے ہی بازوؤں میں بھینچ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بھنگی کمیٹی سے باہر تنخواہ لینے کے لیے بیٹھا ہے۔ میری ٹھوڑی بڑے آرام سے

گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔یہ بات نہیں کہ اس ٹھوڑی کو اٹھائے پھرنا بوجھل معلوم ہورہا تھا بلکہ یہ اس لیے تھا کہ اس طور بیٹھنے سے میں مافیہا سے بے خبر سوچ سکتا تھا۔ چنانچہ میں دنیا جہان کی باتیں سوچنے لگا۔اس دنیا جہان کی باتیں جن سے جیتی متعلق تھی ـــــ

شادی کے بعد پانچ چھ سال تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں لگا دیے.... میری ماں مرگئی تھی۔اس لیے مجھ میں خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہوگیا کہ جیتی میرے یتیم بہن بھائیوں کو اچھی طرح نہ رکھے گی۔ مجھے وہ شدید اختلاف کا دن یاد ہے جب جیتی نے میرے بہن بھائیوں کی نسبت مجھے اچھا کھانا دیا۔ میری ہدایات کے خلاف! اور میں نے انتہائی غصے میں برتن باہر پھینک دیے تھے ـــــ!

جہاں بھی کبھی اس قدر اختلاف ہوتا تھا، جیتی دب جایا کرتی تھی حالانکہ اسے دبنا نہیں چاہیے تھا۔میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی عورت بہت شوہر پرست ہوجائے اور خاوند کی بے ہودہ باتوں کے خلاف بھی احتجاج نہ کرے تو شوہر مزید بے ہودہ باتیں کرتا ہے اور کسی بات کو بے ہودہ نہیں سمجھتا۔برخلاف اس کے جب عورت شور مچاتی ہے اور محلے والوں کو اکٹھا کرلیتی ہے اور نام نہاد شرافت سے سہمی نہیں رہتی تو مرد زیادہ سے زیادہ ایک دوبار ایسا شور بپا ہوتے دیکھتا ہے، اس کے بعد وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ ہر شخص میں جھگڑے سے بچنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اس امتحان کے باوجود اگر کوئی مرد جھگڑالو ثابت ہو تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ مرد، عورت علاحدہ علاحدہ ہوجائیں ـــــ اس دن بھی محلے کے لوگ اکٹھے ہوگئے، عورتوں اور مردوں نے مل کر مجھے شرمسار کیا ـــــ اور میں خود ہی جاکر

سڑک پر سے برتن اٹھا لایا۔

"بات یہ ہے کہ عورتیں ہی عورتوں کو خراب کرتی ہیں" وہ کہنے لگیں جیتی نے اگر تمھیں اچھا کھانا دیا ہے تو بہت اچھا کیا ہے۔ یہ تو ایک اچھی عورت کی صفات میں سے ہے؛ جیتی کہہ رہی تھی، گھر بھر میں مرد ہمیشہ سب سے اچھا کھاتا، اور سب سے اچھا پہنتا ہے، اُس کے بعد کسی کی باری آتی ہے۔" میں اپنے بچے کو وہ کھانا نہیں دیتی جو آپ کو دیتی ہوں —— ہاں اگر میرے اپنے بچے اور تمھارے بہن بھائیوں کے کھانے میں فرق ہو تو مجھے چوٹی سے پکڑ لو....."

اس وقت جب میں یہ باتیں سوچ رہا تھا تو پھر چھڑی کے زمین پر لگنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا بابو جی اپنے ہاں جا رہے ہیں اور ان کی سکھ چین ایک باقاعدہ وقفے کے ساتھ زمین پر پڑ رہی تھی۔ جاتے ہوئے بھی ہری ادم کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس وقت وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ یوگ کو بھی اس کے ننھیال لے جا رہے تھے۔ کمرے کا پٹ آہستہ سے کھلا اور آواز آئی —— "بھاگیرتھ بیٹا! میں جا رہا ہوں ——"

میں نے وہیں سے آواز کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا.... "پھر کب آؤ گے باجی"

"اب جیتی کو کہو نا دو تین مہینے کے لیے ہمارے ہاں چلی آئے"

"اب بھی تو آپ ہی کے ہاں ہے"

"نہیں میرا مطلب ہے" —— بابو جی کہہ رہے تھے —— "میں اس سال وشنو دیوی جا رہا ہوں جیتی بھی میرے ساتھ چلی جائے"

"اچھا باجی —— ابھی راستہ کھلنے میں دیر ہے، سوچ لیں گے

—— پرنام!"

یوگ نے دروازے سے منہ نکال کر مجھے لکڑی کا انجن دکھایا۔ یہ غالباً بابو جی لائے تھے، انجن دکھاتے ہی وہ اونچی آواز میں ہنس کر اپنے نانا کے ساتھ ہو لیا۔ میں کرسی میں ذرا سا ہلا تو اسے خیال آیا کہ میں اسے ننھیال نہیں جانے دوں گا اس لیے وہ فوراً بھاگ گیا۔

جیتی ایک خداداد ذہن کی مالک تھی وہ معمولی سی ہندی جانتی تھی اور بس اسے کسی طور پر پڑھے لکھے ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود میں کبھی اُسے انگریزی فلم دیکھنے کے لیے لیجاتا تو وہ فلم کی ساری کہانی سمجھ جاتی جزوی تفاصیل اور گفتگو کے متعلق وہ لغزش کھا جائے تو کھا جائے لیکن چیز کا مفہوم اور کہانی کے مرکزی خیال پر پہنچتے ہوئے اسے کبھی دیر نہ لگتی۔ بلکہ جب کبھی میں اپنی عادت کے مطابق بے توجہ ہوتا اور اس سے پوچھتا — اب کیا ہوا تو وہ چند ہی لفظوں میں تسلسل قائم کر دیتی ...... لیکن ان خوبیوں کے باوجود جیتی میں شدید نقائص تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی کی پوری بات نہ سنتی تھی۔ درمیان میں بولنے لگتی، دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کو بالکل برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ فوراً دروغ باف کے منہ پر کہہ دیتی کہ یہ جھوٹ ہے حالانکہ یہ اخلاق کے منافی ہے — جھوٹ اس کی برداشت سے باہر تھا اس لیے رشتے دار اس سے نالاں رہتے تھے وہ لاگ لپٹ کے ساتھ بات کرتے تھے، لیکن جیتی انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

میری عادت ہے میں حالات کا مقابلہ کرنے سے جی چراتا ہوں۔ مثلاً مجھے اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو میں اس سے نہیں مانگوں گا، تا وقتیکہ وہ مجھے خود نہ دے دے۔ یا کوئی ایسی بات کرنے سے احتراز کروں گا جس سے میرے دل کا امن و امان تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسے

میں جیتی عین مقام پر پہنچ کر دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ جہاں میں امن و امان کے متعلق سوچتے رہنے سے اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتا ہوں، وہاں وہ لڑ جھگڑ کر ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔ جیتی میرا مرد ہے اور میں اس کی عورت ہوں ...... اور میں کیسے برداشت کر سکوں گا کہ یہ عورت مر جائے اور میں دوسری شادی کر لوں۔

سردار فتح سنگھ حویلیاں والے دروازے میں نمودار ہوئے اور میرے خیالات کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو ڈاکیہ غلطی سے ان کے برآمدے میں پھینک گیا تھا۔ میں نے کہا —— "شکریہ سردار صاحب!" سردار صاحب جواب میں مسکرا دیے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولے گویا کوئی بات اتفاقاً یاد آ گئی ہو —— "آج نہیں اڑے گی کیا؟" میں نے کہا "سردار جی آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" ...... اچھا اچھا —— ہاہا! اچھا —— اور سردار صاحب چل دیے۔ جیتی وہاں ہوتی تو فوراً کہہ دیتی کہ دسکی والی بات سردار صاحب کو اتفاقاً یاد نہیں آئی، بلکہ وہ کچھ دیر پہلے ضرور اس کے متعلق سوچتے رہے ہوں گے، گذشتہ بارش کے روز سے انھوں نے ابر سے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور آج بھی بادل آسمان پر ادھر اُدھر بکھرے نظر آ رہے تھے جنھیں سردار صاحب اپنے تخیل میں یکجا کر رہے تھے۔ شام کے وقت دھند آسمان سے نیچے اتر آئی تھی اور سڑک پر بجلی کی بتی ایک محدود سا رقبہ روشن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ فقط سروس اسٹیشن اور سیو بیر کے درخت دو بلند قامت سایوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر جیتی میری جگہ ہوتی تو اس لفافے کو بھی محض مجھ

تک آنے کا ایک بہانہ سمجھتی۔ یہاں پہنچ کر جیتی سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے اور میں اسے شرانت نہیں سمجھتا۔ اوّل تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی کو ثبوت کے بغیر مجرم سمجھا جائے، اور بالفرض اگر ایسی بات حویلیاں والے سردار کے دماغ میں آئے بھی تو یہ ایک معمولی کمزوری ہے۔ جسے کسی انسان کو جتا دینا بہت برُا ہے.....

میں نے لفافہ کھولا۔ کلدیپ کی چٹھی تھی۔ میں ابھی جو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا اسی کے نام تھا اسی کی ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے یہ خط لکھ کر میرے ساتھ ہمیشہ کے لیے تعلق توڑ لیا تھا۔ میرا کلیجہ میرے منہ کو آرہا تھا۔ میں نے با آواز بلند کہا ——— "گن آنند" جواب آیا "جی ہو" لیکن میں اپنے چائے پینے کے ارادے کو زبان پر نہ لاسکا۔ ابھی ابھی کمبخت کام کر کے ہٹے ہوں گے اور پھر خدا جانے جیتی بھی ہے یا نہیں ——— آخر انسان کے بچے ہیں انھیں دو گھڑی تو آرام کرنا چاہیے۔

لیکن دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے "جی ہو" مجسّم کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس کشمکش کو اتنی توجہ کے قابل نہ سمجھا اور میں نے کہا "بھئی اگر چائے کی ایک پیالی مل جائے تو"..... گن آنند نے کہا۔ بی بی تو پہلے ہی چائے بنا رہی ہے "میں نے کہا" اچھا! اچھا ———"

اور پھر وہی خط۔ آخر اس شخص نے میری زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ پھر میں نے کہا چلو اچھا یہ بھی قصہ پاک ہوا ہر روز یہ آدمی میرا وقت ضائع کیا کرتا تھا، اگرچہ باتیں بڑے کام کی کہتا تھا۔ لیکن آدمی کہی ہوئی باتوں سے کب سیکھتا ہے جب تک اسے خود تجربہ نہ ہو، وہ کب کسی چیز کا قائل ہوتا ہے؟

کلدیپ بھی جیتی کی طرح خداداد ذہن کا مالک تھا اور پھر اس پر پڑھا لکھا آدمی۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کلدیپ اخلاق کا مجسمہ تھا، لیکن اس معمولی سی بات پر اس نے مجھے الوداع کہنا مناسب سمجھا.....

ایک دن میں نے اسے کہا" کوئی آدمی جھوٹ بول رہا ہو اور تمھیں پتا چل جائے کہ وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو کیا تم اسے ٹوک دوگے؟"

کلدیپ نے کہا" موقع کی بات ہے!"

ظاہر ہے، میرے من میں اس وقت بھی جیتی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک بوڑھے دوست کا قصہ سنایا۔ میں نے کہا۔ رفیق ہے نا میرا دوست وہ ایک دن قصہ سنا رہا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا اگرچہ یہ بات مخرب الاخلاق نظر آتی ہے لیکن ہا ہا دل ہی تو ہے ــــــ اس دوست کی بہن سے میری محبت ہو گئی۔ میں نے کہا بھئی ہاں ــــــ ممکن تو ہے۔ رفیق نے کہا ــــــ "یہ سری نگر کا واقعہ ہے۔ میرا دوست ایسے مکان میں رہتا تھا جس کا دروازہ دریائے جہلم کی طرف کھلتا تھا" میں نے کہا ــــــ "ہاں دروازہ بھی جہلم کی طرف کھل سکتا ہے۔"

میں نے کلدیپ کو صاف صاف کہہ دیا کہ رفیق کے گذشتہ اطوار کی بنا پر میں نے یہیں سے اس کی داستان پر شک کرنا شروع کر دیا تھا ــــــ وہ حکایت میں حقائق کا رنگ دینا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس میں رومانی کیفیات بھی پیدا کرے اگر ہم وسکی کا گھونٹ پی لیتے تو یہ واقعہ ضرور شام کے وقت ہوتا جب کہ سورج جہلم پر غروب ہو رہا ہوتا

ہے۔ اور اس کی شعلہ باری پانی پر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی نظر آتی ہے ...... یہی جگہ تھی جہاں کلدیپ نے مجھے ٹوک دیا، اور کلدیپ کا زاویہ نگاہ بھی وہی تھا جو میرا تھا اس منزل پر اس کی داستان میں شک کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ صریحاً غنڈہ گردی تھی۔ بہر حال رفیق نے اپنی بات کو جاری رکھا اور بولا ——

" ایک دن امرسنگھ کالج میں میچ تھا اور مجھے یقین تھا کہ کینز —— (یہ اس کی لڑکی کا نام تھا) کا بھائی ضرور میچ دیکھنے کی غرض سے گیا ہوگا کیوں کہ وہ ایسی پُر رونق جگہوں پر جانے کا بہت شوقین تھا۔ بلکہ میں نے اسے امیرا کدل پر جاتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے کہا آج بڑا سنہری موقع ہے اظہار محبت کا! میں اپنی تمام ہمّت کو جمع کروں گا۔ اور اس کے سامنے اپنے دل کا ماجرا کہہ سناؤں گا...... میں آہستہ آہستہ کینز کے ہاں پہنچا گھر بھر میں میری بے تکلفی تھی۔ میں پردے ہٹاتا ہوا بیٹھک میں پہنچا، کھڑکی دریا کی طرف کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر سے کینز مجھے بخارچے پر کھڑی نظر آئی —— اس وقت سورج ڈوب رہا تھا —— اور بغیر وسکی کے رفیق نے سورج کو غروب کر دیا۔ چنانچہ، سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری شعاعوں نے کھڑکی میں کھڑی کینز کے بالوں کو طلائی مغزی لگا دی تھی گویا سچ مچ سنہری موقع تھا اور کینز کی یہ پیاری پیاری شکل روشنی کے خلاف دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور آخر کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اسے ایک دم بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ چوم لیا —— لیکن میں گھبرا کر الگ ہو گیا۔ وہ کینز نہیں بلکہ اس کی ماں تھی؛"

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔ پہلے رفیق اور میں اور بعد میں کلدیپ

اور ہیں۔ ایک دو باتیں غور طلب تھیں وہ یہ کہ کہانی کے آخر میں یک دم ایسا پلٹا داستان گوئی کے فن کے اعتبار سے بہت پرانی بات ہو چکی تھی۔ لیکن رفیق بوڑھا ہو چکا تھا اور زمانے کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے اپنی تمام داستانوں میں رفیق نے محبت میں اپنے آپ کو کامران ہوتا ہوا کبھی نہیں دکھایا تھا۔ محبت بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوتی تھی اور بس یوں ہی ختم ہو جاتی تھی، بسا اوقات ناکامی پر اپنی داستان کو ناکامی پر ختم کرنا رفیق کا فن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اہل نظر فوراً اعتراض کریں گے کہ تمھارے ایسی شکل کے آدمی سے کون لڑکی محبت کر سکتی ہے؟ اس لیے وہ حدود کے اندر رہنا چاہتا تھا —— کاش! کوئی لڑکی اس سے محبت کرتی تو وہ زندگی میں سچ کے سوا اور کچھ نہ کہتا۔

کلدیپ نے پوچھا —— "پھر تم نے اسے ٹوک دیا؟"

میں نے کہا —— "نہیں اس کے ساتھ جی بھر کر ہنس لینے کے بعد میں نے بھی اسے ایک جھوٹی کہانی سنا دی۔ اس وقت کلدیپ کھڑا ہو گیا اس نے میرے ساتھ پُرجوش مصافحہ کیا اور بولا" بھاگیرتھ تم بہت بڑے آدمی ہو؟ اور میں حیران ہو کر نیچے دیکھنے لگا . . . .

میں اس تعریف سے مزید لطف اٹھانا چاہتا تھا میں نے کہا —— "اخلاق کے لیے بہت عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دستر خوان پر اگر مہمان سالن گرا دے تو میزبان کا یہ فرض نہیں کہ وہ کہے —— "نہیں نہیں کوئی بات نہیں" —— بلکہ اسے یوں ظاہر کرنا چاہیے جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں"

کلدیپ نے مجھے بتایا" میں نے ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو خود بھی

تھوڑا سا لن گرا دیتے ہیں۔ کرنل فاکس میرا دوست تھا، اس کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میرے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔ میں نے اسی وقت دیکھا اس کی بیوی میز کے نیچے اپنا چمچہ گرا چکی تھی۔"۔۔۔۔ پھر کلدیپ نے ایک اور داستان سنائی۔ میسو پوٹیمیا میں پرنس آف ویلز نے ہندستانی فوجیوں کے ساتھ کھانا اسی انداز میں کھایا جس میں فوجی کھا رہے تھے حالانکہ کھانا انگریزی تھا اور ہندی فوجیوں کو اسے کھانے کا سلیقہ نہ آتا تھا۔"

ایسا دوست، کلدیپ میری زندگی سے نکل گیا، کتنا خوش ذوق آدمی تھا، لیکن معمولی سی بات پر ناراض ہو جانا بھی اس کی خوش ذوقی کی علامت ہے؟ کیا یہ غنڈہ گردی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہو، اس کو بتایا جائے کہ وہ مجرم ہے۔۔۔۔ اچھا وہ میری زندگی سے نکل گیا ہے تو نکل جائے اس کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے بتانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پھل چیر کر نہیں رکھنے چاہییں۔ پھل ضائع بھی ہوتے ہیں۔ اور یہ طریقہ بھی نہیں ہے یوں بھی مہمان اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کھاتا ہے اور وہ بھی تھوڑا کھاتا ہے ـــــ لیکن جس مہمان کو میں اصرار سے کھلانا چاہتا ہوں اس کا کیا کروں۔ میں کلدیپ کی باتوں کو سن لیتا مجھے اپنے آپ کو کم عقل کوتاہ بیں مان لینے میں کبھی عذر نہ ہوتا تھا، میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل کرکے خوش ہوتا تھا اور اس میں مجھے زیادہ راحت اور تسکین ملتی تھی۔

کلدیپ چلا گیا ہے تو میں خورشید کو اپنا دوست بنا لوں گا۔ وہ اچھا آدمی ہے، کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ ذہنی اعتبار سے وہ

اتنا بلند نہیں لیکن جب وہ میرے سامنے تھوڑی سی پی کر بہک جاتا ہے
تو مجھے اچھی طرح پتا چلتا ہے کہ پینا بُری چیز ہے۔ کلدیپ کی مدلّل باتوں سے
مجھے پتا نہیں چل سکتا۔

کیا کلدیپ ویسے دوست کے چلے جانے سے زندگی کا کھیل رک جاتا
ہے؟ نہیں.... میں سولہ برس کا تھا جب میرے والد فوت ہوئے تھے
اس وقت دنیا مجھے اپنی آنکھوں میں اندھیر نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا سب
کچھ ختم ہو گیا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک کنوئیں میں ہوں، جس کے
اوپر دیکھنے سے کنارے ملتے معلوم ہوتے ہیں۔ اور جیسے میں نیچے ہمیشہ کے لیے
مدفون ہو جاؤں گا...... میں گھر کے باہر فرش پر اوندھا پڑا رو رہا تھا۔
بدرو کے کناروں کی کچی مٹی کو اپنے دل کے ساتھ لگاتا تھا، تو کہیں تسکین
ہوتی تھی..... ایک چبھن تھی جلن جو سارے جسم کا احاطہ کیے ہوئے تھی..
..... اس وقت مجھے خیال آیا کیا اس کے بعد میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا
——— کیا میرا ہنسنا کھیلنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ میں بدرو کے
کنارے سے اُٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا وہاں میں نے ہنسنے کی کوشش
کی۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ میں ہنس بھی سکتا ہوں ——— میں ہنس رہا تھا اور
ساتھ کے کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی....

اس کے بعد میری شادی ہو گئی اور بابوجی مجھے والد سے زیادہ عزیز
معلوم ہونے لگے۔ میں نے عاطفت کے لیے اپنے سُسر کو قبول کر لیا۔ اب
میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں اور قریب قریب اپنے والد کو بھول چکا ہوں بلکہ
ان کی زندگی میں مجھے اتنی آزادی نہ تھی۔ اب میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں
مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ ایسے جیسے کلدیپ سے علاحدہ ہو کر سبک ہو رہا

ہوں اور اگر جیتی ہنستی کھیلتی چلی جائے —— نہیں نہیں . . . . .

اس وقت تک رات پڑ چکی تھی اور کھانا تیار ہو چکا تھا، گن آنند، آیا اور پریشنری نوکرانی جو برتن توڑا کرتی تھی گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے انھیں سانس تک لینے کی فرصت نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بہت سے مہمان آگئے ہوں۔ حالانکہ با.بو جی آئے اور یوگ کو بھی ساتھ لیتے گئے جس کے نام سے گھر کی رونق تھی اور جو ہر لحظہ کوئی نیا قضیہ کھڑا کیے رہتا تھا۔

اس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ تھوڑی سی پی لوں اور شمشان کی سی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کروں، پتا جی کی محنت پر آنسو بہاؤں اور کلدیپ کی فاتحہ خوانی کرلوں۔ سارے بدن میں متواتر سوچتے رہنے سے جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا اسے آسودہ کرنے کو جی چاہتا تھا، سردار فتح ،موہنہ، اس وقت سونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور کیرتن سوہلا کی آواز دروازے کی جالی سے چھن کر مجھ تک آرہی تھی —— "کیسی آرتی ہوئے بھوکھنڈنا تیری آرتی اناہتا شبد واجنت بھیری"۔ . . . اور ان اَن گنت بھیریوں کی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں الفاظ معدوم ہو گئے اور صرف آوازیں غیر متعلق شور ہو کر میرے تخیل کی معاون ہو گئیں —— میں سوچتا رہا سوچتا رہا اس کرسی میں دبکا ہوا اور ابھی تک کھانے کے لیے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی۔

اگر میری دوسری شادی ہو بھی جائے تو میں زندگی کو استوار کرنے سے پہلے اتنی کشمکش نہیں کر سکتا۔ دراصل میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ اب دوسری شادی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لیکن یہ آسان بات ہے۔ آخر شادی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو گی۔

جو ہر بات کو ہمدردی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گی .... پلنگ پر بیٹھی ہے ایک مدراسی دھوتی پہنے۔ جس کا کنارہ بہت چوڑا اور سیاہ ہے اور یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ساری کا پلّو کہاں ختم ہوتا ہے دھوتی کی زمین سٹیالی ہے اور اس کے تھوڑے فاصلے پر تین تین حلقے نظر آتے ہیں۔ اوپر کا حلقہ سیاہ ہے جو پلّو سے مطابقت رکھتا ہے درمیان کا زرد اس کے اندر کا سفید، پھر نیلا اور آخر میں دھوتی کی زمین ابھری ہوئی ہے ....

وہ خاموش ہے۔ گنواروں کی طرح نہیں ہنستی اور نہ جھوٹ کو اتنا بُرا سمجھتی ہے۔ شاید برا سمجھتی ہو۔ لیکن کہتی نہیں۔ بڑی خاموشی سے مسکرائے جاتی ہے .....

میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ ——— "میں جیون کی اس دوڑ میں تھک گیا ہوں سکھ داں! میں شاید تمہارے ارمانوں کو پورا نہ کر سکوں۔ لیکن میں تمہیں محبت اور سکھ دے سکتا ہوں ایسی محبت نہیں جو شعلہ جوالہ ہو۔ ہاں البتہ ایک دھیمی آنچ جس میں محبت پختہ بھی ہوتی ہے اور خوش ذائقہ بھی .... تمہیں دو یتیم بچے بھی سنبھالنا ہوں گے" اور ان سب باتوں کے جواب میں وہ شرما کر سر ہلا دیتی ہے گویا اسے سب کچھ منظور ہے!

وہ کہہ رہی ہے ——— "میرا خیال ہے، تمہارے دوستوں کو کھانے پہ بلاؤں؟"

"ہاں بلاؤ سکھ داں! یہ تم نے میرے من کی بات کہہ دی" ———

اور ہم ایک فہرست مرتب کرنے لگتے ہیں۔

دوست آتے ہیں کھانا کھاتے ہیں۔ امریکن سینڈٹانی میز پر رکھی جاتی

ہے اور میرے دوست اسے اسٹینڈ پر سے اُٹھا کر کھاتے ہیں۔ اس خیال میں کہ کوئی چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ وہ ٹافی اسٹینڈ سمیت اٹھائی جاتی ہے اور اسے منہ میں ڈال کر اسٹینڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ میں سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ سکھ داں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے دوستوں کی طرح غلط طریقے سے ٹافی کھاتی ہے....

اس کے بعد مجھے جانگلو سی ہنسی سنائی دی۔ میرا ماحول اس وقت اس قدر پُرسکون تھا کہ میں جیتی کی ہنسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل ..... دراصل میں چاہ رہا تھا کہ یہ ہنسی ختم ہو جائے ..... مجھے کھانے کے لیے آواز دی گئی۔ میں اُٹھا جب کہ مجھے اپنی نگاہوں کے افق پر وہ بوڑھا رمال اپنے بازو ہلاتا ہوا گزرتا نظر آنے لگا۔